ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

فروری ۱۹۹۲ء

چوہے ہمارے دور کے چالاک ہوگئے۔

چوہوں پر دلچسپ اور معلوماتی مضمون آئندہ ماہ پڑھنا نہ بھولئے

Put
A PANDA IN YOUR PURSE

A PANDA IN YOUR POCKET

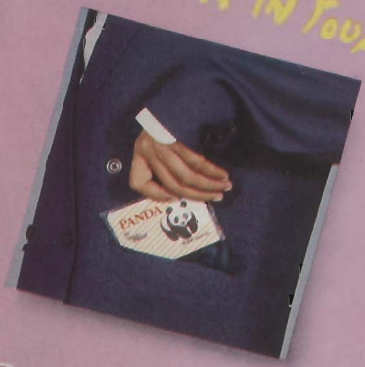

A PANDA IN YOUR PACK

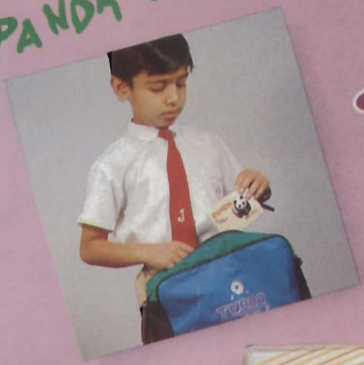

ROSE PETAL
PANDA
PACK

Made from 100% imported wood pulp.

At school, at work or while shopping, hygienic and disposable tissues – so easy to carry!

Hygienic, disposable, easy to carry.

NEED OF THE DAY

A PRODUCT OF PACKAGES LTD.

Prestige

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی نقیب

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

مدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسئول تجمل حسین چشتی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت ساجد سعید، منیر احمد راشد

اشتہارات محمد عرفان

نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی،
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

- ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی سکتی۔

- ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا
- ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۸ فروری ۱۹۹۲ء رجب/شعبان ۱۴۱۲ھ فون ۲۹۹۱۷۸ قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲۴۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

ناقابلِ یقین | حیرت انگیز | لاجواب | بے مثال

آنکھ مچولی

ویڈیو میگزین

پاکستان میں پہلی بار اپنی طرز کا انوکھا، جدید اور لاجواب چلتا پھرتا ویڈیو میگزین
جسے آپ وی سی آر کے ذریعے اپنے ٹیلیویژن پر دیکھ سکیں گے

ماہنامہ آنکھ مچولی کی فخریہ پیشکش

- خوبصورت ڈرامے
- مزے دار خاکے
- لاجواب نغمے
- گیت اور ٹیبلو
- معروف شخصیات
- مشہور کردار
- مزاحیہ خبریں
- سنجیدہ گفتگو
- کام کی باتیں

اور... اور وہ سب کچھ جو آپ ایک خوبصورت ویڈیو کیسٹ میں دیکھنا پسند کریں

- ..... ویڈیو میگزین تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔
- ..... آپ اپنے آرڈر سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔
- ..... اپنی گلی محلے کی ویڈیو کیسٹ شاپ کو ابھی سے مطلع کر دیں۔
- ..... تفصیلات اور حتمی تاریخ سے بہت جلد آگاہ کر دیا جائے گا۔

حُسنِ ترتیب

۸ — تاریخ کے دریچے سے
۹ — ماہِ رواں کی پہلی بات — اداریہ
۱۰ — بخدمت جناب — خطوں کے جواب
۱۵ — اسلام غیر مسلموں کی نظر میں — خالد خلیل
۱۷ — دیر سویر — عادل منہاج
۲۰ — کتنا بڑا انڈا — ادارہ
۲۴ — کرشمہ — اظہر نیاز
۳۱ — کمرۂ امتحان میں — سیما صدیقی
۳۶ — عقل بڑی یا بھینس — خالد رفیق انور
۴۰ — اوڈلی کا احتجاج — سہیل احمد صدیقی
۴۵ — ہمارا ٹھکانہ — ایاز احمد
۴۷ — ٹیڑھی اینٹ — سیدہ ثمینہ اختر سیمی
۵۱ — رام راج کو روک لو — تسکین زیدی
۵۶ — سونے کا ہے پاکستان (نظم) — انور شعور
۵۹ — حادثہ (کوئز کہانی) — اسامہ بن سلیم
۶۵ — ہیرو میٹر — ساجد سعید
۶۷ — بچے کا خواب (نظم) — منظور الرحمٰن احمد
۶۸ — ہے حقیقت کچھ — عقیل عباس جعفری
۷۱ — کرکٹ (ورلڈ کپ ۹۲ء) — راشد عزیز
۷۵ — مولا دلائے تو مل جائے — نوشینہ سحر
۷۸ — نائی کی حجامت (نظم) — عنبر چغتائی
۸۱ — گلگلے — منتخب لطائف
۸۵ — چیزوں کی کہانی — آصف فرخی
۸۹ — زمین کا ردِعمل — اخگر انوار اعوان
۹۱ — ایک تھا بُلبُل — ریاض جاوید
۱۰۲ — درِ حیرت — ایاز محمود
۱۰۷ — قصّہ گو — منیر احمد سومرو
۱۱۱ — جس کی لاٹھی اُس کی بھینس (نظم) — عبدالقادر
۱۱۲ — خوردبین بنائیے — م، الف، راشد
۱۱۵ — ناقابلِ یقین — عظمیٰ سلطانہ
۱۱۹ — بادام — سیّد احسن شہزاد
۱۲۳ — قلم قتلے — مختصر تحریریں
۱۳۴ — ساتھی بچپن کے — تعارف
۱۳۸ — امّی ابّو کا صفحہ — ہما سلیم

ایک شخص مدت سے بے روز گار تھا۔ بے روز گاری سے تنگ آکر اس نے خلیفۂ بغداد کے وزیر، علی بن محمد الفرات کی طرف سے ایک جعلی خط مصر کے گورنر ابو زنبور کے نام لکھا کہ فلاں شخص کو ملازم رکھ لیا جائے۔ گورنر کے پاس خط پہنچا تو انہوں نے تاڑ لیا کہ خط جعلی ہے پھر بھی گورنر نے اس شخص کو ایک معمولی ملازمت دے دی، اور اس کا جعلی خط وزیر کو بھجوا دیا۔ جس وقت جعلی خط پہنچا، وزیر اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے خط پڑھا اور دوستوں سے مشورہ لیا کہ اس جعل ساز کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

ایک دوست نے کہا، "اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔"

دوسرے نے مشورہ دیا، "پورا ہاتھ نہیں صرف انگوٹھا کاٹا جائے۔"

تیسرے نے صلاح دی، "اسے کوڑے لگائے جائیں اور قید کر دیا جائے۔"

چوتھے نے کہا، "گورنر کو لکھا جائے کہ اسے فوراً برطرف کر کے مصر سے نکال دے۔"

وزیر بولے "ہم اس شخص کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں خط لکھنے کی تکلیف نہیں دی ہماری طرف سے خود ہی لکھ لیا۔" وزیر نے قلم اٹھایا اور جعلی خط کی پشت پر مصر کے گورنر کو لکھ بھیجا کہ یہ خط جعلی نہیں ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے دورِ وزارت میں یہ شخص بے روز گار رہا۔ مجھ پر اس شخص کا اس سے زیادہ حق ہے اور اسے اس کی قابلیت کے مطابق اچھی سے اچھی سرکاری ملازمت دی جائے۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

اس پھلتی پھولتی اور پھیلتی دنیا میں جہاں اور بہت سے کاروبارِ زندگی اپنا دائرۂ اثر بڑھا رہے ہیں، وہیں تعلیمی اداروں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ آئے دنوں نت نئے ناموں سے اسکول کھل رہے ہیں، کالجز قائم ہو رہے ہیں، جامعات میں نئے نئے شعبوں کا قیام عمل میں آرہا ہے، تحقیق اور تدریس کے نئے اور انوکھے ذرائع متعارف ہو رہے ہیں۔

بہ ظاہر یہ بہت اچھا شگون ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے آٹھ دس سالوں میں ہماری دنیا کا ہر شخص پڑھا لکھا کہلانے لگے گا اور علم کی ترویج یا ذہنوں کی بیداری سے جو انقلاب برپا ہوگا اس سے پوری دنیا محبت، سکون اور امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔

آج سے کچھ عرصہ قبل تعلیمی ادارے محدود تھے، نتیجتاً ان اداروں سے علم پاکر نکلنے والوں کی تعداد بھی نسبتاً کم تھی اور اعلیٰ تعلیم کا تو تصور بھی عام آدمی کے لئے محال تھا۔ دور حاضر اور سابقہ دور کا اگر موازنہ کریں تو ایک عجیب بات سامنے آتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ پہلے جو لوگ پڑھ لکھ کر نکلا کرتے تھے ان کی بڑی تعداد صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ ہوتی تھی جبکہ آج کے دور میں فارغ التحصیل ہونے والوں کی بڑی تعداد محض ڈگری یافتہ ہے۔ ڈگری یافتہ اور تعلیم یافتہ کا فرق تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے۔

تعلیم حاصل کرنے والے، ڈگری حاصل کرنے والوں سے یوں مختلف ہوتے ہیں کہ ان کے روز و شب کتابوں میں گزرتے ہیں، ان کی آنکھیں علم کی متلاشی ہوتی ہیں، ان کا ذہن فکر و دانش کا خزینہ ہوتا ہے۔ یہی لوگ بڑے ہو کر کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں، ایسے لوگ قوموں کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ جبکہ ڈگری یافتہ لوگ تو محض کاغذ کا ایک پرزہ حاصل کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں، کاغذ کا یہ پرزہ جسے "ڈگری" کہتے ہیں خواہ نقل کر کے حاصل ہو یا پیسے دے کر۔ ایسے لوگوں کے نزدیک علم سے زیادہ اہمیت اس سند کی ہوتی ہے جو ان کی کم علمی پر پردہ بھی نہیں ڈال سکتی۔ عملی زندگی میں بھی ایسے لوگوں کی حیثیت شاعر کی زبان میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ

ع چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان میں

بات طویل ہوگئی۔ ہمیں تو محض یہ کہنا ہے کہ آپ یہ فیصلہ آج کر لیجئے کہ آپ تعلیم یافتہ ہونا پسند کریں گے یا ڈگری یافتہ؟ اگر زندگی کے سفر میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں تو پھر آج سے کتاب اور قلم کو دوست بنا لیجئے۔ ہم آپ کی کامیابیوں کے لئے دعاگو ہیں۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

نواب علی ..... چارسدہ

انکل ..... آپ کی مجلس میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں امید ہے آپ میرا یہ خط ضرور شائع کریں گے کیونکہ اس سے پہلے میں آپ کو دو خط لکھ چکا ہوں مگر آپ نے میرا کوئی خط بھی شائع نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سیما صدیقی ..... کراچی

اپنی تحریر کی عدم اشاعت کے بارے میں آپ کا خط ملا مگر عالمی ادب نمبر ہم دو دن پہلے ہی خرید چکے تھے، چنانچہ جب آپ کا خط ملا اس وقت ہم اپنی "مایوسی" کا سوئم منا رہے تھے۔ ترجمے میں یہی مسئلہ رہتا ہے، خصوصاً مشہور مصنفین کی کہانیوں کا بار بار ترجمہ ہوتا رہا ہے۔ مثلاً آسکر وائلڈ کی کہانی "وفادار دوست" ایک اور پرچے میں دو بار شائع ہو چکی ہے بلکہ وہ انٹر کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ اسی طرح دیگر کئی کہانیاں بھی پہلے چھپ چکی ہیں۔ تحفہ بہت خوبصورت ہے۔

شاہد احمد جاوید ..... بھکر

انکل ..... سب سے پہلے تو نیا سال مبارک ہو۔ اس کے بعد اتنا اچھا عالمی ادب نمبر نکالنے پر مبارکباد۔ اپنی تمام اچھائیوں کے ساتھ اس مرتبہ غلطیوں کی بھی بھرمار ہے۔ مثلاً بعض صفحات کی ترتیب غلط ہے اور بعض کی چھپائی، اور کہیں تو کئی کئی صفحات غائب ہیں۔ "کوئز کہانی" میں دس غلطیاں تلاش کرنی تھیں جبکہ ہمیں اس میں چودہ

غلطیاں نظر آرہی ہیں۔ "ویڈیو میگزین" کب آرہا ہے؟

محمد شاہ کھوکھرائی ..... حیدر آباد

عالمی ادب نمبر نے تو حیران کر دیا، مگر آخر آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ مانا کہ آنکھ مچولی پاکستان کا سب سے اچھا رسالہ ہے لیکن اس پر اتنا غرور نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے اتنی کہانیاں، نظمیں اور لطیفے بھیجے مگر کوئی بھی شائع نہیں ہوا۔ آخر کیوں؟

عمران خان یوسف زئی ..... پشاور

پورے عالمی ادب نمبر میں کوئی پاکستانی کہانی نہیں تھی، کیوں؟ کیا پاکستانی ادب کیلئے آپ کے پرچے میں جگہ نہیں ہے؟ یا آپ پاکستانی ادب کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اسے آنکھ مچولی میں جگہ دیں؟

صداقت حیات زخمی ..... لاہور

یہ تحریر بھجوانے کے لئے کوپن ساتھ بھجوانے کا کیا سلسلہ آپ نے شروع کر دیا ہے؟ اس کا مقصد شاید یہ ہو کہ جو کوئی بھی آپ کو تحریر بھیجے وہ آپ کا رسالہ ضرور خریدے۔ ہو سکتا ہے اس طرح آپ کا رسالہ زیادہ بکنے لگے مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ وہ غریب بچے جو آنکھ مچولی لائبریری یا کسی دوست سے لے کر پڑھتے ہیں، کیسے اپنی تحریریں بھیجیں گے؟ کیا آنکھ مچولی میں غریبوں کی شرکت آپ کو گوارا نہیں ہے؟ برائے کرم اس کوپن کی پابندی ختم کریں۔

رخسانہ عرف موہنی ..... حیدر آباد

آپ نے "روشن مثال" کا سلسلہ شروع کیا تو ہم بہت خوش ہوئے تھے کہ چلو ہمارا نام بھی اس طرح آنکھ مچولی میں چھپ جائے گا۔ خوب محنت کر کے سابقہ جماعتوں کی طرح میٹرک کے امتحان میں بھی بہت اچھے نمبر لائے۔ مگر آپ نے تو وہ سلسلہ ہی ختم کر دیا اور ہم "بن کھلے مرجھا گئے"۔

محمد عابد ..... سانگھڑ

ڈیئر انکل ..... عالمی ادب نمبر پڑھا، بہت پسند آیا۔ مگر قیمت دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ رسالہ صرف امیروں کیلئے ہے ..... خیر چھوڑیں ..... کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطیفے بالکل بور ..... لطیفوں کا یہ نیا سلسلہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ براہِ کرام پرانا سلسلہ بحال کریں اور یہ آپ کا کیلنڈر ادھورا کیوں ہے؟ کیا جولائی کے خاص نمبر کے ساتھ بھی کیلنڈر ہی دینے کا ارادہ ہے؟

مدثر عنایت ..... واہ کینٹ

آنکھ مچولی میں اشتہارات کی زیادتی اور اچھی کہانیوں کے فقدان کی وجہ سے اس کا معیار گر گیا ہے۔ اشتہار

کسی رسالے کی مجبوری ہرگز نہیں ہوتے۔ آپ بیشک دو تین روپے قیمت بڑھا دیں مگر کہانیاں زیادہ کریں اور اشتہار بند کر دیں۔

عبدالحفیظ شاہد..... مخدوم پور پہوڑاں

ڈیئر انکل..... عالمی ادب نمبر کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حیرت ناک کیلنڈر کا تحفہ بہترین تھا۔ آج تک کسی نے بھی ایسے شاندار تحائف نہیں دیئے ہوں گے۔ لطیفوں کا نیا سلسلہ بیکار ہے اسے بند کر دیں۔

خرم علی شفیق اور ساتھی..... کراچی

آپ کا رسالہ بچوں کے معیاری ادب میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے اندازے کے مطابق اسے ہر طبقے اور ہر عمر کے بچے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی عام تحریریں ہمیں پسند ہیں مگر دسمبر ۹۱ء کے شمارے میں این بلوچ صاحب کی تحریر "کون سا مذہب اچھا ہے؟" پڑھ کر ہمیں افسوس ہوا اور ہمارے بعض دوستوں کی دل آزاری بھی ہوئی ہے۔ ان کا تعلق دوسرے مذاہب سے ہے۔

منزہ یعقوب..... بنوں

ڈیئر انکل..... آپ آنکھ مچولی میں صرف بڑے لوگوں کے انٹرویو کیوں شائع کرتے ہیں۔ کبھی کبھی فنکار بچوں کے انٹرویوز بھی شائع کیا کریں۔

علی اصغر سیال..... ساہیوال

جناب یہ بتائیں کہ ہمارا کوئی حق نہیں آنکھ مچولی پر؟ آپ ہمارے خط کو سیدھا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ بہرحال ایک تجویز ہے کہ آنکھ مچولی کا نام تبدیل کر کے ماہنامہ "ستارہ" رکھ دیں۔ کیونکہ اب یہ عظمتوں کے آسمان پر چمکنے لگا ہے۔ ویسے بھی آنکھ مچولی بچوں والا نام ہے جبکہ اب یہ رسالہ بچوں کا نہیں رہا۔

سلمٰی رانا..... گلشن اقبال، کراچی

انکل..... اتنا اچھا عالمی ادب نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ آنکھ مچولی "ویڈیو میگزین" کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ اسے خریدنے کے لئے ہم نے انتظام کر لیا ہے اور دوستوں اور محلے کی ویڈیو شاپس پہ بھی پیشگی اطلاع دے دی ہے۔

محمد بلال بخاری، عمران حیدر..... کوٹ ادو

اپنی پچھلی روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے آنکھ مچولی کے عالمی ادب نمبر نے ہمارے ذہنوں پر خوشگوار نقش چھوڑے ہیں۔ آپ کی طرف سے نئے سال کا یہ تحفہ اتنا پسند آیا کہ بس.....

ملک محمد عرفان اعظم ..... (؟)

ڈیئر انکل..... آداب۔ میں آنکھ مچولی کا باقاعدہ قاری ہوں۔ "عالمی ادب نمبر" میں نے "نوید بہار بک اسٹال" سے خریدا۔ ٹائٹل پر لکھا تھا کہ حیرت ناک کیلنڈر کا تحفہ اس کے ساتھ ہے۔ مگر جو رسالہ میں نے خریدا اس کے ساتھ تحفہ نہیں تھا۔ میں نے چونکہ تحفہ گھر جاکر چیک کیا تھا، اس لئے میں دوبارہ دکان پر گیا اور اسے تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے پہلے تو کہا کہ کیلنڈر رسالے کے اندر ہو گا لیکن جب میں نے انکار کیا اور اسے بتایا کہ پلاسٹک کا لفافہ ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا تو اس نے الٹا مجھ پر الزام لگا دیا کہ میں نے تحفہ نکال لیا ہو گا۔ اور اب میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ انکل خدا کی قسم میں نے تحفہ نہیں نکالا تھا اور نہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ مگر میں چھوٹا ہوں ناں! اس لئے دکاندار نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ انکل! مجھے بہت ملال ہوا کہ آپ کا تحفہ مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ مجھے اپنی توہین کا بھی دکھ ہے اور یہ دکھ ساری زندگی رہے گا۔

عزیز ساتھیو! اس بار آپ لوگوں کے بے حد اصرار پر خطوں کے جوابات عام روش سے ہٹ کر دیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوں کو شاملِ اشاعت کیا جا سکے۔ مگر اس کے باوجود بہت سے خط جواب دینے سے رہ گئے ہیں اور وجہ ظاہر ہے کہ صفحات کی کمی ہے۔ اس لئے ہم ان ساتھیوں سے معذرت خواہ ہیں۔

اکثر قارئین نے صرف عالمی ادب نمبر کی تعریف میں خط لکھے ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ لوگوں کے صرف نام شائع کر رہے ہیں۔

کچھ حضرات نے بہت معصومانہ خطوط ارسال کئے ہیں اور کچھ نے بہت ہی جارحانہ۔ ایسے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ غصہ اور ناراضگی اپنی جگہ مگر شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے کتب فروشوں سے جو آنکھ مچولی کے تحائف بچوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ گزارش ہے کہ وہ اپنے رویئے پر نظرِ ثانی فرمائیں اور معصوم بچوں کا دل توڑنے سے گریز کریں۔

عالمی ادب نمبر کی پسندیدگی پر ہم آپ سب لوگوں کے شکر گزار ہیں۔ پروف ریڈنگ اور بائنڈنگ کی نادانستہ غلطیوں پر معذرت۔ جن حضرات کی قابلِ اشاعت تحریریں صفحات کی کمی کی وجہ سے خاص نمبر میں شائع نہ ہو سکیں، ان سے بھی معذرت۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں انہیں شاملِ کر لیا جائے گا۔

خاص نمبر میں پاکستانی ادب سے کوئی کہانی نہ چھاپنے پر بہت سے لوگوں نے اظہارِ ناراضگی کیا ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم نے پاکستانی ادب سے ایک نظم "کولمبس ثانی" شائع کی ہے۔ خاص نمبر میں چونکہ زیادہ سے زیادہ ممالک کے ادب کا انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ہر ملک کی کم کم چیزیں شائع کی گئی ہیں

اور پاکستانی ادب تو ہم ہر ماہ پیش کرتے ہی رہتے ہیں۔

تحریر بھجوانے کے لئے کوپن کی شرط کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اب آپ بغیر کوپن کے بھی تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔ "ویڈیو میگزین" انشاء اللہ بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔ فنکار بچے کا انٹرویو بھی عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تحریروں کا مقصد بچوں کی اخلاقی تربیت اور علم میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ ان سے قطعاً کسی شخص یا گروپ یا مذہب کی تحقیر مطلوب نہیں ہوتی۔ اگر کسی تحریر سے کسی صاحب کی دل آزاری ہوئی ہے تو ہم اپنی اس سہو پر معذرت خواہ ہیں۔ اور آخر میں چند ساتھیوں کے نام جنہوں نے ہمیں خلوص بھرے خطوط لکھے۔

.....○○○.....

فرح ناز عمر، ایف بی ایریا کراچی۔ سجاد قریشی، گوٹھ پاٹار۔ حماد الرحمٰن مغل، بہاولنگر۔ مریم خان، ملیر ہالٹ کراچی۔ نورین ساجد، عنبرین ساجد (جگہ کا نام نہیں لکھا)۔ ادیبہ خان، بہاولپور۔ ایس، آر راحت، خانپور۔ قیصر محمود قیاسی، مانسہرہ۔ عابدہ ادیبہ کوثر سلمیٰ اسحاق، شاہدرہ ٹاؤن لاہور۔ عبدالرحمٰن خان، سعودی عرب۔ اشفاق احمد ناز، بلدیہ ٹاؤن کراچی۔ حاجی محمد اسماعیل، نیوملتان۔ عمران خان، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ انیل محمود مرزا، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ شہزادہ الماس، ملتان۔ اطہر رضا اجنبی، لیاقت آباد کراچی۔ محمد زمان، بارکھان۔ ساجد حبیب عزیز، کراچی۔ نورین اختر، کوہاٹ۔ عدیل احمد جلیل، حیدر آباد۔ محمد ذیشان حیات، نواب شاہ۔ واسد حسین شاہ، کراچی۔ سید محمد جنید عالم، حیدر آباد۔ عثمان اصغر، شالامار ٹاؤن لاہور۔ محمد نواز ضیاء کشمیری، منڈی بہاؤالدین۔ رفاقت اللہ یوسف زئی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عظمیٰ قیوم، مظفر گڑھ۔ راشد منہاس ثاقب، برجکلاں قصور۔ آغا فاروق احمد، کندھ کوٹ۔ محمد فیصل، (جگہ کا نام نہیں لکھا)۔ منصور ساجد، گجرات۔ میاں جاوید زمان رنیکاوٹو، منچن آباد۔ سائرہ رحمٰن، سرگودھا۔ محبوب عبدالرزاق، ایف بی ایریا کراچی۔ طارق محمود، فیصل آباد۔ جعفر علی شاہ، سیالکوٹ۔ محمد عظیم انجم، سبی بلوچستان۔ وجاہت حسین، ملتان۔ سید عثمان اختر، لاہور۔ ثمینہ شاہین، پشاور۔ محمد علی انصاری، عبدالقدیر انصاری، (جگہ کا نام نہیں لکھا)۔ نیلم پروین، پشاور۔ عمر دراز حسین، ملتان۔ خالد بخاری، گھوٹکی۔ مہر مظہر نواز سہو، ملتان۔ خاور مجید، ڈیرہ اسماعیل خان۔ نسیم احمد نور، پسنی۔ محمد خباب امین، لاہور۔ حسین احمد غفرلہ، حیدر آباد۔ وقاص احمد صدیقی، کراچی۔ رابعہ ابراہیم، کراچی۔ محمد رفیق اکبر، حیدر آباد۔ راشد منہاس ثاقب، قصور۔ اظہر عباس، جھنگ۔ م۔ الف شیرازی، ٹنڈو آدم۔ محمد ارشد ہمدم، اٹک۔ محمد ریحان، اسلام آباد۔ عبدالباسط میمن، کراچی۔ محمد سلطان جھنڈیر، ملتان۔ زاہدہ خیر محمد مغل، حیدر آباد۔ کنول معراج، کراچی۔ ساجد بشیر، ڈیرہ بلیساں۔

اسلام غیر مسلموں کی نظر میں

خالد خلیل

اسلام ایک عظیم مذہب ہے اسلام کی صداقت، حقانیت اور ہمہ گیری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلموں کی حالت کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس بات کو غیر مسلموں نے بھی مانا ہے۔یہاں چند غیر مسلم مشہور مدبرین کے اسلام کے بارے میں خیالات تحریر کئے جارہے ہیں۔

سر ولیم میور ..... مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جس پر اسلام کا دارو مدار ہے یہ ہے کہ خدائے واحد کی مرضی پر توکل کرنا۔ معاشرت کے معاملے میں بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیز گاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

مہاتما گاندھی ..... میں دنیا کے مذاہب کا مطالعہ کرنے کا عادی ہوں میں نے اسلام کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اسلام ایسا مذہب ہے جس میں اعلیٰ اخلاق کی پاکیزہ تعلیم ہے اس میں مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے مفید باتیں اور ہدایتیں ہیں۔

ایڈورڈ گبن..... محمدؐ کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک ہے۔قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کی بنیاد ایسے مستحکم اور مضبوط اصول پر قائم کی گئی ہے جس کی نظیر دنیا کے تمام مذاہب میں نہیں پائی

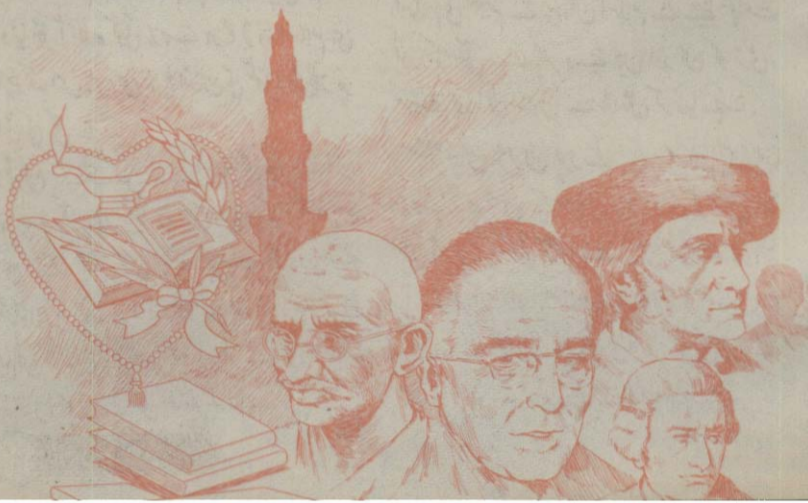

جاتی۔

پنڈت جواہر لال ..... اسلام وہ نئی قوت تھی جس نے عربوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا اور ان میں خود اعتمادی اور جوش عمل کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

ارکھاٹ ..... اسلام کے اصول کے مجموعہ سے ایسا نظام سیاست قائم ہوگیا ہے جس کی قوت اور متانت کے سامنے تمام سیاسی نظام ہیچ ہیں۔

پادری کینن آئزک ٹیلر ..... اسلام نے مذہب کا اصل اصول خدا کی وحدانیت اور عظمت قرار دی، انسانوں میں باہمی اخوت قائم کی، اسلام میں بلا کا استحکام اور جاذبیت ہے جو شخص اسلام قبول کرلیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس کا شیدائی ہو جاتا ہے۔

جارج برنارڈ شا ..... دنیا سے مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے لیکن اس زمانہ میں اگر کوئی مذہب باقی اور برقرار رہ سکتا ہے تو وہ اسلام ہے میرا تو خیال ہے کہ اگر دنیا کا آئندہ کوئی مذہب ہوگا تو وہ اسلام ہی ہوگا چونکہ اس میں بنی نوع انسان کی مکمل طریقہ پر رہنمائی کی گئی ہے۔

گاڈفری ہیگسن ..... اسلام کی جاذبیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ آٹھویں صدی کے آخر میں بت پرست ترکوں نے مسلمانوں پر حملہ کر کے سلطنت بغداد کو تباہ کر دیا لیکن ان فاتحوں نے تھوڑے ہی عرصے میں مغلوب مسلمانوں کا مذہب بھی اختیار کرلیا۔

ڈاکٹر گستاولی بان ..... دنیا میں مذاہب پیدا ہوئے اور مٹ گئے لیکن مذہب اسلام کے اعتقادات کو زمانہ نہ مٹا سکا اور آج بھی ان کا اثر ویسا ہی پُرزور ہے جیسا پہلے تھا۔ اگرچہ جس وقت عیسائیوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کرلیا تو اس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا لیکن مذہب کا بدلنا قبول نہیں کیا، کیا اسلام کی جاذبیت اور حقانیت کی اس سے بڑھ کر کوئی تاریخی دلیل ہو سکتی ہے۔

پادری مرقش ڈاڈ ..... اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس سے عقل انسانی کو ایک فطری مناسبت ہے اور جس نے مشرکین تک کے دلوں میں اپنی طرف سے تنفر نہیں پیدا کیا۔

موسیو لیون داس ..... دین اسلام تمام دوسرے مذہبوں سے بہتر اور افضل ہے جو لوگ اس میں عیب نکالتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اسلام کی تعلیم نے پیروان اسلام کے سینے شجاعت اور حوصلگی سے بھر دیئے ہیں اور ان کو نرمی، مروت اور اعلیٰ اخلاق سے مالا مال کر دیا ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ ..... اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے اصول سے سب کو اتفاق ہے اور جس میں کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ قرآن اور اسلام نے ناجائز محصولوں کو ختم کر دیا۔ تجارت کو ترقی دی اور اسلام کی وجہ سے غیر مذاہب کے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔

دیر سویر

تحریر: الیگزانڈر واسکن، ترجمہ: محمد عادل منہاج

الیگزنڈر جب چھوٹا تھا تو دوسرے تمام بچوں کی طرح وہ بھی اسکول جایا کرتا تھا۔ دوسرے تمام بچے تو اسکول کی گھنٹی بجنے سے پیشتر ہی اسکول پہنچ جاتے مگر الیگزنڈر ہمیشہ دیر سے پہنچتا۔ کبھی کبھار تو وہ اس وقت اسکول پہنچتا جب دوسرا پیریڈ شروع ہو چکا ہوتا۔ اس کی ٹیچر اس کے اتنی دیر سے اسکول پہنچنے پر حیران بھی ہوتی اور خفا بھی۔ وہ کہتی کہ اس نے اتنا سست بچہ اس سے پہلے نہیں دیکھا اور ہیڈ مسٹریس کہتی کہ ایسا بچہ تو شاید دوسرے کسی اسکول میں بھی نہ ملے۔

"یہ ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔" وہ کہتیں، "اور اس کے والدین کہتے ہیں کہ ہم اس کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔" اور یہ واقعی سچ بھی تھا۔ الیگزنڈر کے والدین بھی اس کی عادتوں سے عاجز آ گئے تھے۔ ہر شام اس کے گھر میں ایک ہی کہانی دہرائی جاتی۔ "کیا تم اپنا ہوم ورک کر چکے ہو؟" اس کی والدہ پوچھتیں۔

"ایک منٹ امی۔ ابھی کرتا ہوں۔" وہ ایک کہانی کی کتاب پڑھنے میں مشغول جواب دیتا۔

"یہ کتاب پڑھنا بند کرو اور فوراً ہوم ورک کرنا شروع کرو۔" اسکی والدہ کہتیں۔

"صرف ایک صفحہ اور۔" الیگزنڈر جواب دیتا۔ وہ ایک صفحہ ختم کرتا اور دوسرا صفحہ پڑھنا شروع

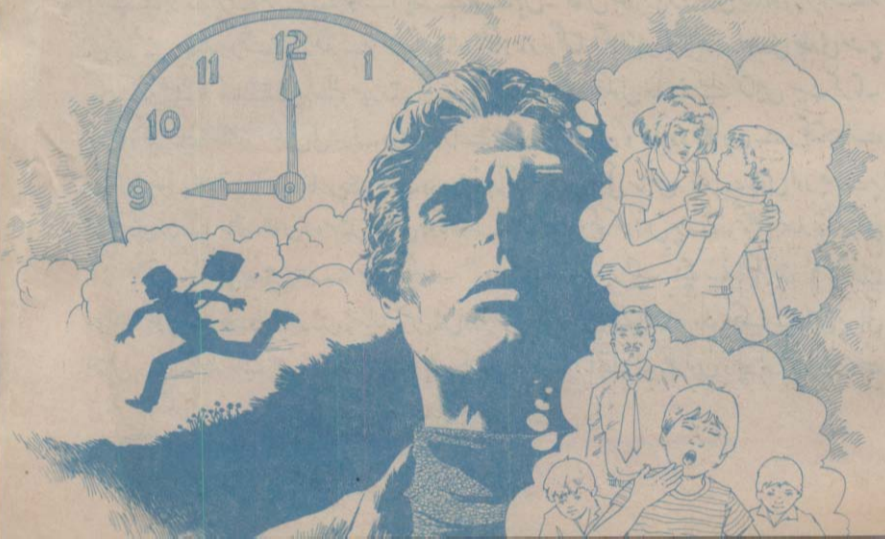

کر دیتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنی مزیدار کتاب رکھ کر اسکول کا بور قسم کا کام شروع کرے۔

"اب کتاب رکھ دو۔"

"ایک منٹ۔"

"کتاب رکھ دو۔"

"بس ایک منٹ۔"

آخر کار اس کی والدہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور وہ اس سے کتاب چھین لیتیں۔ بس الیگزنڈر ناراض ہو جاتا اور رونا دھونا شروع کر دیتا۔ اپنی کتاب واپس مانگتا اور کہتا کہ جب تک اسکی کتاب واپس نہیں کریں گی وہ کام نہیں کرے گا اور یوں شام گزر جاتی۔ جب الیگزنڈر ہوم ورک کرنے بیٹھتا تو رات ہو چکی ہوتی اور وہ کام کرتے کرتے اونگھنے لگتا۔ اس کے والدین اسے بار بار جھنجھوڑتے اور وہ پھر اونگھنے لگتا۔ یوں وہ اس اونگھنے جاگنے میں جیسے تیسے کام کرتا اور اس کے والدین بھی تھک ہار کر سو جاتے۔

صبح کو ایک مختلف کہانی ہوتی۔ "اٹھ جاؤ۔" اس کی والدہ کہتیں۔

"اٹھ رہا ہوں۔" وہ آنکھیں ملتا ہوا کہتا اور دوبارہ بستر پر گر جاتا۔

"اٹھو، جلدی کرو۔" اس کی والدہ چلائیں۔

"ایک منٹ امی۔"

"تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔"

مگر جناب جب رات کو دیر سے سوئیں تو صبح اٹھنا کتنا مشکل لگتا ہے، یہ تو سب جانتے ہیں۔ اس وقت بچے بڑے مزے مزے کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر اسکول جانا ہو، پھر تو اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہتا اور الیگزنڈر اونگھتا، انگڑائیاں لیتا اٹھتا۔ جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارتا ناشتے میں الٹے سیدھے نوالے لیتا اور آخر کار اسکول جانے کیلئے کتابیں سیٹ کرتا۔ یوں وہ گھر سے نکلتا اور اسکول کی طرف دوڑتا۔ راستے میں وہ ہر گھڑیال کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتا جو اسے بتاتا کہ اسکول کا وقت تو کب کا ہو چکا۔ جب وہ دوڑتا بھاگتا، پھولی ہوئی سانس، بکھرے بالوں اور چہرے پر اڑتی ہوائیوں کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوتا تو سب بچے اسے دیکھ کر ہنس پڑتے۔ کبھی کبھار تو ٹیچر بھی مسکرا اٹھتی۔ "آہا یہ ہیں ہمارے سوتو شاگرد۔" وہ کہتی۔ ایک بار ایک بچے نے الیگزنڈر کا کارٹون بنایا جو اسکول کے ہفتہ وار اخبار میں چھپا۔ جس میں وہ بستر پر لیٹا تھا اس کے والد اور والدہ جگ سے اس پر پانی انڈیل رہے تھے اور ایک الارم کلاک اس کا کان پکڑ کر اسے اٹھا رہا تھا۔ یہ کارٹون دیکھ کر الیگزنڈر بہت ناراض ہوا مگر اس کی دیر سے آنے کی عادت نہ گئی۔

چونکہ الیگزنڈر اپنا ہوم ورک رات کو اونگھتے ہوئے کرتا اس لئے وہ کبھی بھی اپنا کام صحیح نہ کر پاتا اور پھر صبح کو وہ اسکول دیر سے پہنچتا لہٰذا وہ نئے مضمون کا ابتدائی حصہ بھی نہ سن پاتا اور پھر بقایا لیکچر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی دیر کرنے کی عادت کی وجہ سے وہ پھر ہر کام جلدی جلدی میں کرتا اور یوں ہر وقت الجھا ہوا رہتا۔

یونہی الیگزنڈر کے شب و روز گزرتے رہے۔ اس کے والدین کوئی راستہ نہ پاسکے وہ اپنی سادی زندگی میں ہر کام دیر سے کرنے کا عادی ہو گیا وہ اسکول دیر سے پہنچتا۔ کالج دیر سے پہنچتا۔ یہاں تک کہ نوکری ملنے کے بعد اپنے آفس لیٹ پہنچتا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔ اسے بار بار سزائیں ملتیں۔ ڈانٹ کھاتا اور شرمندگی اٹھاتا۔ اپنی اس خراب عادت کی وجہ سے اس نے بہت کچھ کھویا۔ وہ دعوتوں اور تقریبات میں اتنی دیر سے پہنچتا کہ لوگ اسے دوبارہ کبھی نہ بلاتے۔ وہ اپنی بزنس کی میٹنگوں میں دیر سے پہنچتا اور یوں بعض اوقات اس کے بزنس کے معاملات خطرے میں پڑ جاتے۔

بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ نئے سال کے آغاز کے موقع پر جب وہ خوش آمدید کہنے کے لئے باہر نکلتا تو اکیلا ہوتا کیونکہ سب لوگ نئے سال کی مبارکباد کے بعد سو چکے ہوتے اور اسے ایک بار پھر دیر ہو چکی ہوتی۔ اس کے دوست اس کے دیر کی عادت کی مختلف کہانیاں بناتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ بے چارہ تو یہ بھی بھول چکا تھا کہ آہستہ کیسے چلا جاتا ہے وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا۔

جب وہ رات کو سونے کے لئے لیٹتا تو خواب میں دیکھتا کہ وہ پھر چھوٹا سا الیگزنڈر بن گیا ہے اور اپنے اسکول جا رہا ہے۔ اسکول پہنچنے پر ہر کوئی اسے مبارکباد دیتا ہے، ہیڈ مسٹریس اسے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کرتی ہیں، اس کی تصویر اسکول کے آڈیٹوریم میں لگائی جاتی ہے اور جب وہ آڈیٹوریم میں داخل ہوتا ہے تو بینڈ بجتا ہے اور سب اس کے استقبال کے لئے اٹھتے ہیں مگر ہر بار اس موقع پر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ پھر چھوٹا سا بن جائے تو اسکول کبھی دیر سے نہ جائے۔

دعوت

ایک دفعہ مرزا غالب نے حالی کو اپنے ہاں دعوت پر مدعو کیا اور خوب خاطر تواضع کی۔ رفتہ رفتہ تواضع کا معیار گرتا گیا اور بات مرغ سے دال پر آگئی۔ سو حالی نے اجازت لی اور گھر آگئے۔

کچھ دنوں بعد حالی نے غالب کو اسی سلسلے میں دعوت دی اور پہلے دن ہی غالب کے آگے دال پیش کر دی... غالب سے رہا نہ گیا اور پوچھا "کیا معاملہ ہے میاں؟"

حالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "معاملہ تو کچھ بھی نہیں آپ اوپر سے نیچے آئے اور اسکے برعکس ہم نیچے سے اوپر۔"

کتابڑا انڈا

ادارہ

معلومات عامہ کی کتابوں میں، کوئز کے مقابلوں میں ہم نے یہی پڑھا اور سنا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انڈا شتر مرغ کا ہوتا ہے۔ یہ بات درست سہی مگر پھر یہ بتایئے کہ سامنے، رنگین صفحے پر جو انڈا آپ دیکھ رہے ہیں یہ کس کا ہے؟

بلا مبالغہ یہ انڈا شتر مرغ کے چار نہیں تو تین انڈوں کے برابر تو ہو گا ہی۔ پچاس افراد کے ناشتے کے لئے اگر یہ ایک انڈا بھی پکالیا جائے تو شائد کافی ہو۔

ہم آپ کو بتائیں کہ یہ انڈا مڈغاسکر کے جنگلوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ جس پرندے کا یہ انڈا ہے اس کی نسل اب دنیا سے ختم ہو چکی ہے۔ مگر یہ انڈا شناسوں کا کمال ہے کہ انہوں نے اسے آج تک محفوظ کیا ہوا ہے۔ اس انڈے سمیت دنیا کے اور بہت سے انڈوں کے بارے میں ہم ایک معلوماتی مضمون آپ کے مطالعے کے لئے آئندہ ماہ شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ انڈوں کے موضوع پر آئندہ ماہ شائع ہونے والا دلچسپ مضمون سردیوں کی مناسبت سے کافی مزے دار رہے گا۔ آپ پڑھنا نہ بھولیئے۔

دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا انڈا

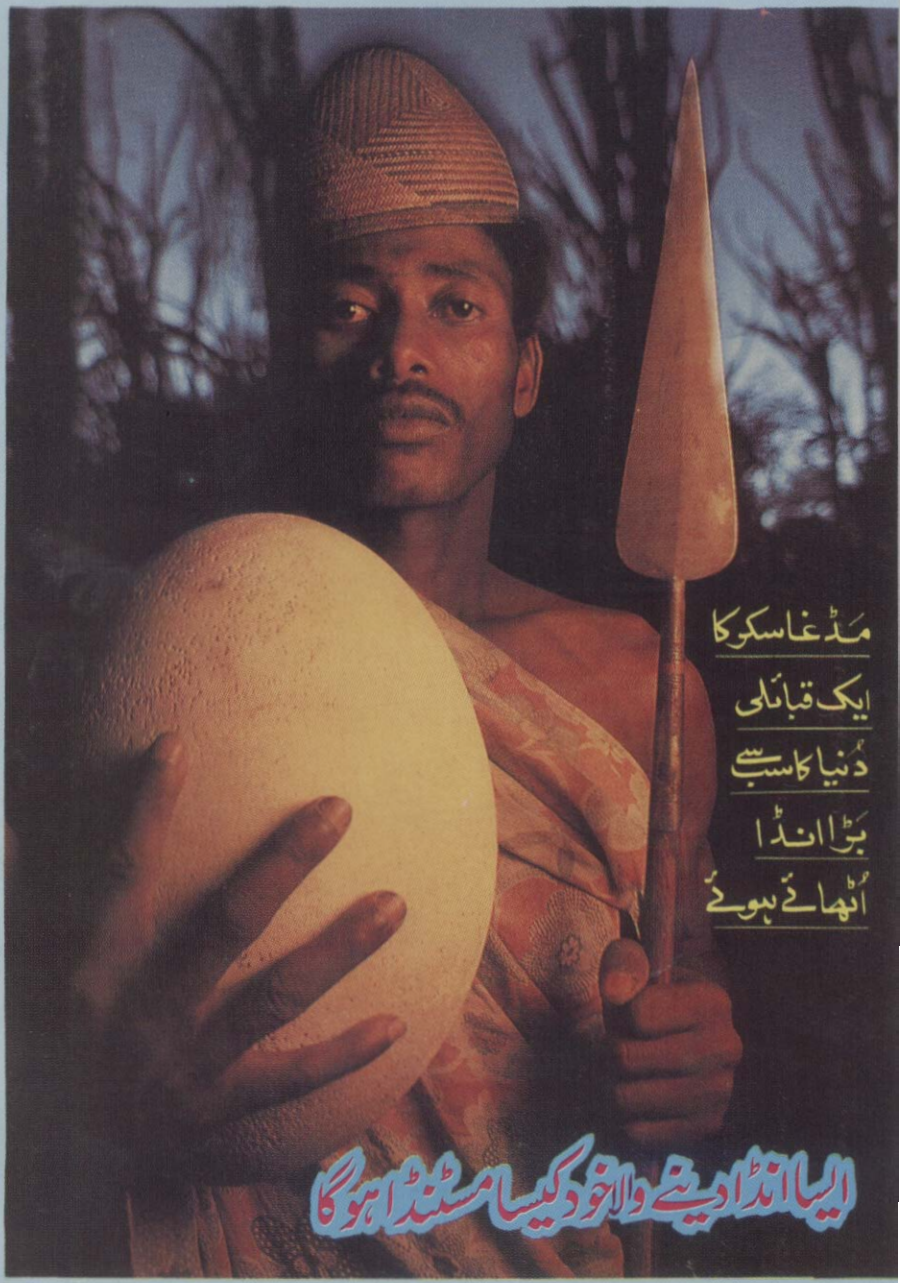
مڈغاسکر کا
ایک قبائلی
دُنیا کا سب سے
بڑا انڈا
اُٹھائے ہوئے
ایسا انڈا دینے والا خود کیسا مسٹنڈا ہوگا

دریائے سندھ

ضیا اسلام پوری

ابلتا جوش کھاتا جب نکلتا ہے پہاڑوں سے
گزر کر وادیوں غاروں نمک کے کوہساروں سے
وہ کالا باغ سے اوپر قدم میداں میں دھرتا ہے
قیامت خیز موجوں کی روانی میں گزرتا ہے
اگرچہ شوخ ہوتا ہے مگر چپ سادھ لیتا ہے
ہزاروں ریت کے جرار لشکر ساتھ لیتا ہے
جدھر کو رخ بدلتا ہے تباہی ساتھ لاتا ہے
زمینداروں کی بدبختی کے افسانے سناتا ہے
زمینِ زرفشاں کے یہ ہزاروں کھیت کھاتا ہے
زمینداروں کے ارمانوں کو مٹی میں ملاتا ہے
ہزاروں بسنے والوں کو کیا برباد ظالم نے
ہزاروں خاندانوں کو کیا ناشاد ظالم نے

کرشمہ

اظہر نیاز

قسط نمبر ۱

ذیشان اپنے کمرے میں اسکول کا کام کرنے میں مصروف تھا کہ امی نے آکر بتایا کہ اس کا دوست جواد آیا ہوا ہے۔

"جواد!..... کہاں ہے وہ؟" ذیشان نے پوچھا۔

"تم اپنے کام میں مصروف تھے ناں۔" ذیشان کی امی نے کہا۔ "اس لئے تمہارے ابو نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھالیا ہے اور اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب تم اسکول کے کام سے فارغ ہو جاؤ تو اس سے مل لینا۔ ٹھیک۔" ذیشان نے مسکراتے ہوئے امی کی طرف دیکھا اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

جواد سے ملتے ہی آغا عمران کو وہ ساری باتیں یاد آگئیں تھیں جو جواد سے منسوب تھیں۔ انھیں جواد سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ جب ذیشان نے اپنے دوست کا تعارف کرایا تھا۔

"یہ میرا دوست ہے جواد..... میری کلاس میں پڑھتا ہے۔"

جواد نے آگے بڑھ کر آغا صاحب سے ہاتھ ملایا۔

"ابو آپ کے کوئی دوست ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر ہیں؟"
"کیوں بھئی کیا ہوا؟" آغا صاحب نے پوچھا۔
"میرے دوست کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔"
"بس یہی شوق ہے یا کوئی اور شوق بھی ہے ؟"
"مجھے خوفناک کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ جس میں جن ہوں، بھوت ہوں، بلائیں ہوں ..... جادوگر ہوں۔"
"آپ یہ کہانیاں پڑھ کر ڈرتے بھی ہوں گے ؟" آغا صاحب نے پوچھا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" جواد نے کہا "ایسی کہانیاں پڑھ پڑھ کر تو میں بہت بہادر ہو گیا ہوں۔"
"ابو ..... جواد تو خود بھی کئی قسم کے جادو کر لیتا ہے۔"
جواد ہنسا ..... "دراصل انکل، میرے دوست یہی سمجھتے ہیں کہ مجھے بھی جادو آتا ہے لیکن دراصل ایسا ہے نہیں۔ مجھے جادو وغیرہ پر بالکل یقین نہیں ہے۔"
"ابو ..... جواد نے کئی مرتبہ ہمیں ایسی باتیں بتائیں جو بعد میں سچ ثابت ہوئیں۔"
"مثلاً؟" آغا صاحب نے پوچھا۔
"اس نے کہا ..... شاہد کل اسکول نہیں آئے گا اور وہ دوسرے دن اسکول نہیں آیا۔"
"تو آپ نے معلوم کیا کہ وہ کیوں نہیں آیا؟" آغا صاحب نے پوچھا۔
"جی ابو ..... ایک حادثے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"
"یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔"
"لیکن ابو اس طرح کے اتفاقات اکثر جواد کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔"
"ہاں ہو سکتا ہے۔" آغا صاحب نے کہا "ہاں تو بیٹے آپ کو ٹی وی میں کام کرنے کا شوق ہے ؟"
"جی انکل میری خواہش ہے کہ میں ایک ایکٹر بنوں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر سمندر کے کنارے گھوڑا دوڑاؤں میرے ہاتھ میں اصلی پستول ہو۔ میرے آگے ڈاکو بھاگ رہے ہوں۔ میں گولیاں چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔"
آغا صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے۔
"انکل آپ ہنس رہے ہیں ؟"
"بیٹے میں اس لئے ہنس رہا ہوں کہ ابھی آپ کی عمر پڑھنے کی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ پڑھیں،

لکھیں، بڑے آدمی بنیں، پولیس اور فوج میں بھرتی ہوں، ملک کی خدمت کریں، ملک کے دشمنوں کا صفایا کریں اور پھر اگر فرصت ملے تو ٹی وی ڈراموں میں بھی کام کریں۔ میں اپنے ایک دوست کو جانتا ہوں جو ڈراموں میں کام کرتا ہے اور پولیس کا بڑا افسر بھی ہے۔ اس نے ڈراموں میں کام کرنے کے لئے خاص طور پر اجازت لے رکھی ہے وہ ڈراموں میں بھی ملک کے دشمنوں کا صفایا کرتا ہے اور اصل زندگی میں بھی ڈاکوؤں کا تعاقب کرتا ہے۔"

"ابو..... جواد بہت ہوشیار ہے اور اس کے پاس کافی وقت بچ جاتا ہے یہ اپنے فارغ وقت میں ٹی وی پر کام کرنا چاہتا ہے۔"

"آپ نے تو باقاعدہ بحث شروع کر دی۔ اچھا وکیل صاحب۔" آغا صاحب نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا، کوئی نہ کوئی واقف کار ٹی وی میں نکل ہی آئے گا۔ اب تم جاؤ اور کھیلو....."

"ہاں ابو۔ آج کل آپ کسی اغوا وغیرہ کے کیس پر کام کر رہے ہیں....."

"جی کر رہا ہوں لیکن آپ کو کس نے بتایا؟"

"جواد نے۔"

"اور جواد بیٹے آپ کو کس نے بتایا۔"

"انکل مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

اور آغا صاحب نے اس دن سوچا تھا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن چھوٹے بچوں سے کام لے رہا ہو اور انہیں ذیشان کا دوست بنا کر میرے گھر بھیج رہا ہو..... جواد اس وقت بھی ان کے سامنے بچوں کے ایک رسالے کو بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ آغا عمران پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

وہ دن انہیں اچھی طرح یاد تھا۔ وہ پیر آفتاب مرزا والے کیس سے سخت پریشان تھے۔ جواد کے بارے میں انہوں نے مکمل رپورٹ حاصل کی تھی۔ جواد کے والد اشتیاق علی احسن شریف آدمی تھے معززین شہر میں شمار کئے جاتے تھے۔ جواد کی اپنی سرگرمیاں مشکوک تھیں۔ اکثر بچوں کا خیال تھا کہ وہ جادو جانتا ہے اور کئی ایسی باتیں بتا دیتا ہے جو مستقبل قریب میں ہونے والی ہوں۔

آغا صاحب نے اپنی جیپ نکالی اور پیر آفتاب مرزا سے ملنے کا ارادہ کر کے اپنے دفتر سے نکل کھڑے ہوئے۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اب وہ ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جو ذیشان کے اسکول کے سامنے سے گزرتی تھی۔ وقت دیکھا تو ذیشان کی چھٹی کا وقت تھا۔ گیٹ کے پاس انہوں نے رفتار ویسے ہی کم کر دی۔ حالانکہ انہیں علم تھا کہ ذیشان اسکول کی گاڑی سے گھر چلا جائے گا لیکن پدرانہ محبت میں وہ ویسے ہی اسکول کی طرف دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی نظر

ذیشان پر پڑی جو اپنے دوست جواد کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ رک گئے اور ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ ذیشان اور جواد گیٹ کے پاس آکر رک گئے۔ غالباً دونوں گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

آغا صاحب نے ہارن بجا کر ان کو متوجہ کیا اور وہ دونوں آغا صاحب کی طرف بھاگے۔

"ابو..... آپ مجھے لینے آئے ہیں ؟"

"نہیں بیٹے..... بس ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے سوچا آپ کو دیکھ لوں۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے آج ہمارے اسکول کی بس خراب ہوگئی ہے۔ اور میں نے اور جواد نے طے کیا تھا کہ جواد کی گاڑی پر چلیں گے۔ اس کی امی آرہی ہوں گی اس کو لینے۔ آپ آگئے ہیں تو اب آپ ہم دونوں کو چھوڑ دیں۔"

"کیوں نہیں..... آیئے جواد بیٹے۔ میں آپ کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں انکل..... وہ امی آئیں گی تو مجھے نہ پاکر پریشان ہوں گی۔"

آغا صاحب نے دل ہی دل میں جواد کو داد دی۔ اور اتنے عرصے میں جواد کی امی بھی گاڑی لے کر وہاں پہنچ گئیں۔

آغا صاحب نے گاڑی بڑھادی تو جواد نے پیچھے سے آواز دی۔ ذیشان نے فوراً اپنے ابو سے کہا کہ وہ گاڑی روکیں۔ جواد کچھ کہہ رہا ہے۔ "بیٹے وہ کچھ نہیں کہہ رہا۔ غالباً اپنی امی سے کچھ کہہ رہا ہے۔"

"نہیں ابو..... وہ ہمیں رکنے کے لئے کہہ رہا ہے۔"

آغا صاحب نے گاڑی روک لی۔ جواد پیچھے بھاگا آرہا تھا۔

جواد کی امی کھڑی دیکھ رہی تھیں کہ جواد کو کیا ہو رہا ہے..... اچانک میری طرف آتے آتے پھر ذیشان لوگوں کی طرف بھاگ رہا ہے۔ جواد جیپ کے پاس آکر رک گیا۔

"انکل آپ ذیشان کو گھر چھوڑ کر کہاں جائیں گے ؟"

آغا صاحب چونکے۔ کیوں کہ وہ پیر آفتاب کے گھر جانا چاہتے تھے۔

"کیوں خیریت تو ہے ؟" آغا صاحب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... ایسے ہی۔" اتنے میں جواد کی امی بھی قریب آگئیں۔

"اسلام علیکم! جی میں جواد کی امی ہوں۔ یہ کوئی الٹی پلٹی ہانک رہا ہوگا میں نے سوچا کہ خود جاکر آپ کی جان چھڑاؤں۔"

"آج آپ ڈرائیو نہ کریں تو اچھا ہے۔" جواد نے کہا۔
"بیٹے۔" جواد کی امی نے منع کرتے ہوئے کہا۔
"معاف کیجئے گا۔" جواد کی امی نے آغا صاحب سے کہا "یہ اکثر لوگوں کو مشورے دیتا رہتا ہے ..... جواد چلو" اور وہ جواد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف چل پڑیں۔
آغا عمران ذیشان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔" بیٹے یہ سب اتفاقات ہوتے ہیں۔ جیسے میں آپ کو لینے پہنچ گیا۔ حالانکہ مجھے قطعی معلوم نہ تھا کہ آپ کے اسکول کی گاڑی خراب ہے۔ اس طرح تو آپ جواد کی طرح مجھے بھی جادوگر کہہ سکتے ہیں۔"
آغا صاحب نے ذیشان کو گھر اتارا اور خود پیر آفتاب مرزا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔
پیر آفتاب مرزا کی محل نما حویلی کی سڑک مڑتے ہی ایک دیوہیکل ٹرالر آغا عمران کی جیپ سے ٹکرایا۔ ٹرالر اتنا اچانک اس موڑ سے نمودار ہوا تھا کہ آغا صاحب اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔
ٹرالر کے ٹکراتے ہی جیپ نے دو تین قلابازیاں کھائیں اور حویلی کی دیوار سے جا ٹکرائی۔
آغا عمران پہلی قلابازی پر ہی جیپ سے باہر جا گرے تھے۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود حواس پر قابو نہ رکھ سکے۔ ان کا سر سڑک سے اتنی زور سے ٹکرایا تھا کہ آغا صاحب کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ذہن میں ایک زور دار چھپاکا ہوا اور پھر روشنی کا گولہ اندھیرے میں بدل گیا۔
آغا صاحب کو اپنے "جنگل جنگل" مشن کی ساری باتیں یاد آرہی تھیں کہ کس طرح ڈاکوؤں نے ان کے بیٹے ذیشان کو اغوا کر لیا تھا اور پھر جواد کی مدد سے وہ اس قابل ہوئے تھے کہ ذیشان کو چھڑا سکیں۔
"انکل ....." جواد نے آغا عمران کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا۔
"آپ میرے بارے میں سوچ رہے ہیں ناں ؟"
"نہیں ..... ہاں میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تمہیں ٹیلی ویژن ڈراموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔"
"جی انکل۔"
"میں نے تمہارے لئے بات کی تھی۔ میرے ایک دوست ہیں ٹیلی ویژن پروڈیوسر، وہ آج کل میں بچوں کے لئے ایک پروگرام شروع کرنے والے ہیں۔ میں تمہیں ان کا فون نمبر دوں گا۔ تم میرے حوالے سے ان سے مل لینا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن آپ میرے بارے میں یہ تو نہیں سوچ رہے تھے۔"

آغا صاحب سخت پریشان ہوئے۔

"بیٹے اگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔"

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ نہیں سوچ رہے تھے، کچھ اور سوچ رہے تھے۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" آغا عمران نے کہا، "میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چل جاتا ہے۔"

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن یہ ہے کہ خطرے کا مجھے یکدم احساس ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ پتا ہے انکل اسکول میں کیا ہوا؟ ہم سب بچے پڑھنے میں مصروف تھے کہ یکدم مجھے خیال آیا کہ چھت گرنے والی ہے۔ میں اٹھا اور زور سے چلّایا۔ سب لوگ کمرے سے باہر نکل جائیں چھت گرنے والی ہے۔ اور میں خود بھی باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، تمام بچے اور استاد صاحب بھی کمرے سے باہر نکل آئے، ہمارے باہر نکلتے ہی چھت کا ایک حصہ گر پڑا۔ میری بات کو کچھ بچوں نے مذاق سمجھا اور کمرے میں بیٹھے رہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی بچ گئے کیونکہ چھت کا حصہ جہاں سے گرا تھا وہاں سے بچے باہر نکل گئے تھے.....

اب میں اسے کیا کہہ سکتا ہوں ؟" جواد نے پوچھا۔

"تم اسے چھٹی حس کہہ سکتے ہو۔"

"چھٹی حس؟" جواد نے پوچھا۔

"ہاں۔" آغا عمران نے کہا "تمام عام انسان پانچ حواس یعنی حواس خمسہ سے کام لیتے ہیں۔ یہ حواس خمسہ دیکھنا، سونگھنا، سننا، چکھنا اور چھونا ہیں لیکن بعض لوگ چھٹی حس کے مالک ہوتے ہیں۔"

"لیکن ابو..... جواد ساتویں حس کا مالک ہے۔" ذیشان نے آتے ہوئے کہا،

"یک نہ شد دو شد۔" آغا عمران نے مسکراتے ہوئے کہا "آیئے آپ کی کمی تھی۔"

"واقعی ابو۔ جواد ساتویں حس کا مالک ہے، بالکل جادوگر..... اسے بعض چیزوں کا ایسے پتہ چل جاتا ہے جیسے مستقبل کو یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو....."

"پھر تو آپ کو یہ بھی پتہ چل جاتا ہوگا کہ امتحان میں سوال کون سے آنے والے ہیں۔" آغا عمران نے مسکراتے ہوئے جواد سے پوچھا۔

"یہ مشکل ہے۔" جواد نے کہا۔

"تم نے کوشش کی کہ....."

"جی انکل۔ میں نے کئی مرتبہ امتحانوں سے پہلے سوچا کہ مجھے سوالوں کا پتہ چل جائے لیکن نہیں چلا۔

ویسے مجھے ضرورت بھی نہیں۔ میں محنت اتنی کرتا ہوں کہ کوئی بھی سوال آجائے، میں حل کر لیتا ہوں۔"

"شاباش۔" آغا عمران نے کہا "انسان کو ترقی کرنے کے لئے محنت ہی کرنی چاہئے۔ الہ دین کے چراغ کے خواب نہیں دیکھنا چاہئیں۔"

"لیکن ابو۔" ذیشان نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ جواد کے پاس الہ دین کا چراغ ہی ہے..... یہ چراغ رگڑتا ہے جن حاضر ہو جاتا ہے..... کیا حکم ہے میرے آقا..... مجھے یہ بتاؤ کہ اسکول کی چھت کب گرے گی..... میرے آقا، اگر کہو تو ابھی گرادوں ہاں تھوڑی سی گرادو....."

اس کے بعد تینوں نے مل کر قہقہہ لگایا اور آغا عمران اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تو لڑکو..... مجھے تھوڑا سا کام ہے، تم بھی کوئی کام کرو کیونکہ قائداعظم نے کہا ہے، کام..... کام..... کام....." ذیشان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں ..... اور اگر کام کرلیا ہے تو کھیلو....."

"انکل۔" جواد نے جاتے ہوئے آغا عمران صاحب کو آواز دے کر مخاطب کیا۔

"ہاں لڑکے کیا بات ہے۔" آغا عمران نے خاص انداز سے پوچھا.....

"آپ آج کل کسی خاص کیس پر کام کر رہے ہیں ؟"

"اگر میں کہوں کہ ہاں۔ آج کل میں ایک خاص کیس پر کام کر رہا ہوں تو ؟"

"تو کچھ نہیں انکل۔"

"دراصل آپ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ آج کل کسی اہم کیس پر کام کر رہے ہیں اور اگر کام نہیں کر رہے ہیں تو دو چار دن میں آپ کو ایسا کیس ملے گا جو آپ کو کافی پریشان کرے گا۔ اور آپ کو اس کیس کے دوران .....ق ....." جواد کچھ کہتے ہوئے رک گیا..... ذیشان کی طرف دیکھا، پھر آغا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا ..... "میرا مطلب ہے کہ آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے خیال کیجئے گا....."

آغا صاحب کے چہرے پر یکدم سنجیدگی آگئی۔

وہ چپ چاپ ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔

ان کے پاس آج کل کوئی کیس نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ کیوں ڈر سے گئے تھے۔

کمرۂ امتحان میں

سیما صدیقی

صاعقہ اور ریحانہ یک جان دو قالب سہیلیاں سمجھی جاتی تھیں۔ رول نمبر کے حساب سے ہم ان کے درمیان آگئے تھے۔ دو دوستوں کے درمیان دیوار بننا تو نہیں چاہتے تھے مگر کیا کرتے، تقدیر کے لکھے کی طرح انرولمنٹ نمبر کو بھی بھلا کوئی مٹا سکا ہے؟ ہم نے اسے ریحانہ اور صاعقہ کی بدقسمتی قرار دیا مگر بعد ازاں ہمیں معلوم ہوا یہ ان کی نہیں ہماری بدقسمتی تھی، کیونکہ انہوں نے ہمیں رابطے کے پل کی طرح بے دردی سے استعمال کیا۔

ہم نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ پیچھے والی لڑکی اللہ کے بعد صرف ہم پر بھروسہ کر کے پرچہ دینے آئی

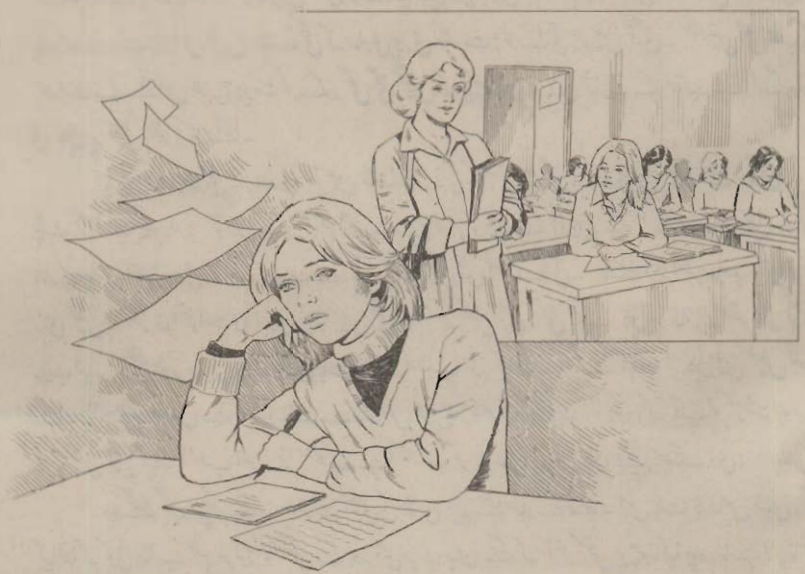

ہے۔ وہ مسلسل ہماری کمر پر دستک دے کر پوچھ رہی تھی کہ صرف یہ بتا دو کہ اس سوال کا جواب کتاب میں کہاں سے کہاں تک ہے؟ خوب!! پہلے تو طالب علم صفحات پھاڑ کر لاتے تھے یا محنت کر کے پرچے تیار کرتے تھے اب ان جھنجھٹوں میں پڑنے کے بجائے کتاب ہی رکھ لاتے ہیں۔ بہرحال ہم کان لپیٹ کر اپنا کام کرتے رہے اور ظاہر کیا گویا کچھ سنا ہی نہ ہو۔

دو سوال کے حل کے بعد ہم پرچہ ہاتھ میں لئے خود کو یقین دلا رہے تھے کہ یہ ہمارے ہی کورس کا پرچہ ہے اور بالآخر اسے ہمیں ہی حل کرنا ہے کہ اچانک پیچھے سے ٹہو کا لگا اور ایک ضمیمہ (سپلیمنٹ کاپی) اُڑتا ہوا، کسی کٹی پتنگ کی طرح ہماری کرسی پر آگرا۔ عقب سے سرگوشی ابھری "ذرا ریحانہ کو دکھا دو..... یہ جواب یہیں تک اتارنا ہے ناں!" اس دلیرانہ حرکت پر ہمارے اوسان خطا ہوگئے، مگر اب کاپی ہمارے زون میں داخل ہو چکی تھی چنانچہ سرسری نظر دوڑائی، اوہ مرے خدا! کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نقل کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی چوٹی کی ہانڈی میں دو پیسے کی بھی عقل ہوتی تو گزارا ہو جاتا۔ محترمہ نے یہ جواب صفحۂ کتاب سے براہِ راست اتارا تھا۔ چنانچہ روانی، نادانی یا بے دھیانی میں اوّل تا آخر لکھتی چلی گئی تھیں۔ ایک جگہ لکھا تھا "جیسا کہ آپ کو گزشتہ ابواب میں بتایا جاچکا ہے کہ....." ہم جماعت ہونے کا حق تو ادا کرنا ہی ٹھہرا۔ چنانچہ پینسل سے اس قسم کے خطرناک جملوں کو خط کشیدہ کر کے دے دیا اور جھلّا کر سرگوشی کی "بیوقوف! یہ کاپی میں نہیں لکھنا ہے۔" اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ربر سے کچھ اس طرح مٹانے لگی کہ ہماری پوری نشست زلزلے کی زد میں آگئی۔ نشستیں بھی طلبہ کی سہولت کے لئے اس طرح پیوستہ کر کے رکھی گئی تھیں کہ پیچھے والی ہر لڑکی شانے کے عقب سے آگے والی کی کاپی پر کڑی نظر رکھ سکے۔

پانچ منٹ بعد ہی پھر ہماری کمر میں نقب لگانے کی کوشش کی گئی۔ ہماری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پلٹ کر اسے گھورا..... تو اس نے "ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے" کے مصداق کاپی دوبارہ ہماری جانب اچھال دی۔ اف میرے خدا! یہ لڑکی تو ہمیں بھی پھنسائے گی۔ سامنے ایگزامنر صاحبہ بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ مگر خدانخواستہ وہ ابدی نیند نہیں تھی۔ آنکھ کھل بھی سکتی تھی۔ کاپی پر طائرانہ نظر ڈالی تو سر پیٹ لیا۔ واضح طور پر اس نے ہماری بات کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا "کاپی میں نہیں لکھنا ہے۔" چنانچہ انہوں نے کمال ذہانت سے کچھ اس طرح ترمیم فرمائی تھی۔ "جیسا کہ آپ کو گزشتہ ابواب میں نہیں بتایا گیا۔" اب ہم نے "ٹھیک ہے!" کہہ کر ہار مان لی اور کاپی پیچھے پھینک دی۔

دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ سوالات جلیبی کی طرح سیدھے سادے تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ کوئی طالب علم سر توڑ کوشش کے بعد بھی یہ نہ جان سکے کہ آخر ممتحن پوچھنا کیا چاہ رہا ہے؟ چنانچہ

سوال سمجھنے اور پھر اپنے طور پر جواب ترتیب دینے میں کافی وقت صرف ہو رہا تھا۔ بعض سوالات کا کورس سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا قیمتوں کا سرکاری نرخ ناموں سے۔ مزے کی بات یہ کہ کئی طلبہ مائیکرو بک ہاتھ میں لئے بغلیں جھانک رہے تھے اور شاید ممتحن کا مقصد بھی یہی تھا۔

رٹّے، پر یقین رکھنے والے طلبہ کسی اداس بگلے کی طرح پر گرائے بیٹھے تھے، ہمت نہ ہارنے والوں کی نشستوں سے کتابوں کے صفحات الٹنے پلٹنے کی واضح آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے ایگزامنر کی جانب دیکھا مگر وہ نجانے کیوں تغافل سے کام لے رہی تھیں۔

دوسرے دن ہمیں چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والا محاورا سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ ابھی ہم نے دوسرے سوال کا آغاز ہی کیا تھا کہ آگے والی محترمہ نے قدرے ترچھا ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی، (اگر وہ زور سے بول لیتی تو شاید اتنا شور نہ ہوتا) ہم نے گھبرا کر انوجیلیٹر (Invigilater) کو دیکھا۔ ''سنو! صاعقہ سے کہو مجھے معلّم کا منصب دے دے۔'' ''کیا!!'' ہم ششدر رہ گئے۔ ''بھلا صاعقہ تمہیں معلم کا منصب، کیسے دے سکتی ہیں؟ جب تک تم پڑھ لکھ کر کسی قابل نہ ہو جاؤ..... بلکہ بہت قابل نہ ہو جاؤ۔'' ''اونہو! بھئی معلّم کے منصب والے مضمون کا پرچہ مانگ لو۔'' صاعقہ نے اس کا پیغام سن کر کندھے اچکا دیئے اور انگوٹھا ترچھا کر کے برابر والی رو کی جانب اشارہ کیا۔ (یعنی معلّم کا منصب ادھر چلا گیا تھا) آگے والی نے اپنا مطالبہ پھر دہرایا ہم بھنا گئے۔ ''بھئی پرچہ کرنے دو..... ویسے ہی ایک گھنٹہ گزر گیا ہے۔ معلّم کا منصب کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ تلاش جاری ہے۔'' اسی اثنا میں پیچھے والی نے پھر دستک دی اور ایک پرزہ ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم نے دیکھا کہ مسلسل گردش کے سبب معلّم کا منصب خاصا خستہ حال ہو چکا تھا۔ ویسے بھی یہ مائیکرو اسٹیٹ کافی تھی اور ہم نے مائیکرو چشمہ نہیں بنوایا تھا۔ ہمیں حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ ہمارے طلبہ ذہین نہ سہی باریک بین ضرور ہیں اور قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔

چند طلبہ خاصی تیاری کر کے آئے تھے۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھے مگر چونکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی چنانچہ یہ چند طلبہ خود کو خاصا احمق محسوس کر رہے تھے۔ طلبہ پھرّوں سے مائیکرو تک جا پہنچے تھے اور یہ ابھی وہی لکھ پڑھ کر پرچہ دینے کے فرسودہ چکروں میں الجھے ہوئے تھے۔

اردو کے پرچے والے روز ہم چاہتے تھے کہ ابتدائی دو ڈھائی گھنٹوں میں جو تیر مارنا ہے، مار لیں، کیونکہ آخری آدھ گھنٹے میں انوجیلیٹر صاحبہ رضا کارانہ طور پر کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی تھیں۔ ان کی پیٹھ پیچھے مذاکرات کی فضا اتنی سازگار ہو جاتی تھی کہ کمرۂ امتحان مچھلی بازار بلکہ قومی اسمبلی کے

ہال کا منظر پیش کرنے لگتا تھا۔
تشریح کے آغاز کے لئے ہم کوئی عمدہ سا جملہ سوچ ہی رہے تھے کیونکہ سنا تھا کہ ممتحن پہلے اور آخری جملے کو پڑھ کر ہی تخت یا تختہ کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ جونہی ہمیں ایک شاندار جملہ سوجھا عین اسی لمحے پیچھے سے دھکا لگا اور جملہ آگے سے نکل گیا۔ "کیا مصیبت ہے! اتنا لمبا پرچہ...... صرف تین گھنٹے اور اوپر سے ممتحن کی تمامتر معصومیت کے ساتھ یہ ہدایت کہ "صرف پانچ سوالوں کے جواب تحریر کیجئے۔" ظاہر ہے تین گھنٹوں میں بمشکل تین چار ہی سوالات کے جواب دیئے جاسکتے ہیں۔ اس ٹھو کا پیٹی، امداد باہمی اور پیغام رسانی کا کوئی ایکسٹرا ٹائم تو ہمیں دیا نہیں جاتا۔ پیچھے سے صاعقہ نے پچکارا، "بس اتنا بتا دو کہ "اختر شیرانی" فرماتے ہیں یا فرماتی ہیں؟" ہم نے پلٹ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ "یہ تو اختر شیرانی سے پوچھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے اور یہ تمہیں ایسی متنازعہ شخصیت پر لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"
اسی اثنا میں پانی پلانے والی خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ عقابی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کمال ہشیاری سے چادر میں سے ایک پاکٹ سائز کتاب نکالی اور کونے میں بیٹھی طالبہ کی کرسی پر سرکا دی۔ صاعقہ نے با آواز بلند اطمینان کی سانس لی۔ "شکر ہے...... بیرونی امداد آگئی۔" بیرونی امداد! جی ہاں کچھ خیر خواہ باہر بھی موجود تھے جو وقتاً فوقتاً حسب توفیق اندر والوں کو "ایڈ" بھیجتے رہتے تھے۔ چونکہ ہم رابطے کے پل کا کام بھی کر رہے تھے لہٰذا گھومتے گھماتے وہ کتاب ہمارے پاس بھی آگئی۔ کتاب کیا تھی گویا کوزے میں دریا بند تھا۔ سرورق پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا۔ "پروفیسر اے زیڈ خان کی طلبہ کی سہولت کے لئے آسان شرح" اور طلبہ نے مزید سہولت کے لئے شرح کی بھی مائیکرو بک تیار کروالی تھی تاکہ یاد کرنے کا جھنجٹ ہی نہ رہے۔ بیرونی رضا کار کی فرض شناسی اپنی جگہ...... لیکن ان گائیڈ بک، ورک بک اور گیس پیپرز کو دیکھ کر ان اساتذہ کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے، جن کو طلبہ کی سہولت اور ان کے مستقبل کی اتنی فکر ہے۔ ابھی ہم سرورق پر ہی اٹکے تھے کہ آگے والی نے جھٹکے سے کتاب اچک لی۔
اگلے روز انویجیلیٹر ذرا کھری ٹائپ کی تھیں۔ چنانچہ کمرۂ امتحان میں "پن ڈراپ سائلنس" رہا انہوں نے ایسی دہشت بٹھادی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر کوئی پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو پتھر کا ہو جائے گا۔ کرنے والوں نے اس دن بڑے سکون سے پرچہ حل کیا۔
آخری پیپر والے دن بڑا غضب ہوا۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ چنانچہ امتحان کی مصیبت کے ساتھ "آشوب چشم" کا مرض بھی آ وارد ہوا۔ پیپر دیکھ کر دماغ ویسے ہی کام نہیں کرتا تھا اب آنکھوں نے بھی جواب دے دیا۔ بہرحال نیّا تو پار لگانی ہی تھی لہٰذا گز بھر لمبے رومال سے آنکھ دبا کر بیٹھ رہے۔ اب ہم مساوات کے اصولوں کے عین مطابق سب کو ایک آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ اندرونی دباؤ

سے ویسے ہی ذہن منتشر رہتا تھا اب بیرونی مداخلت بھی شروع ہوگئی۔ انویجیلیٹر نے ایسی چشم پوشی سے کام لیا جیسے امریکہ کی مداخلت پر ہماری سرکار درگزر سے کام لیتی ہے۔ باہر کھلنے والی کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ مگر ہمارے ہاں غیر قانونی کاموں کے لئے کوئی نہ کوئی روزن تو کھلا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ایک کاغذی راکٹ روشندان سے اڑتا ہُوا آیا اور ریحانہ کی نشست کے پاس آگرا۔ باہر سے ایک نہایت گھمبیر آواز آئی۔ "پلیز! یہ راکٹ ثمینہ کو دے دیں۔" "کیا!!" "ثمینہ کو دے دیں؟ مگر آج تو وہ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہے۔ اب ہم میں سے کوئی اتنا ڈھیٹ بھی نہیں کہ انویجیلیٹر کے سامنے راکٹ اٹھائے اور منہ اٹھا کر ثمینہ کو دینے نکل جائے۔ اسی اثنا میں باہر سے ایک دوسری آواز ابھری جس میں بے پناہ سوز اور درد پایا جاتا تھا۔ با آواز بلند ارشاد ہوا۔ "حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے، لڑکا ہوں اگرچہ میں ذرا سا" سن کر لڑکے کی آہ وزاری انویجیلیٹر کوئی پاس ہی سے بولیں۔ "اللہ نے دی ہے ان کو عقل، یہ خود ہی کریں گی پرچے کو حل....." مگر ان کے خیالات پر لڑکے نے مطلق توجہ نہ دی اور آبجیکٹو (Objective) سوالوں کے نمبروار جواب بتانا شروع کر دیئے۔ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اس کی معلومات نہایت ناقص تھیں۔ کسی اچھے گھر کا گھٹیا چشم وچراغ معلوم رہا تھا۔ جو ناحق طلبہ کو مس گائیڈ کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے کہا "میڈم باہر پولیس والے ڈنڈا لے کر بیٹھے ہیں۔ آخر وہ کونسی غیر مرئی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان سے کہیں ناں کہ ان کو بھگائیں۔" میڈم نے ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے کسی بے وقوف کو بہت دن بعد دیکھا ہو۔ پھر خود اٹھ کر روشندان کے قریب آئیں اور تین مرتبہ ہش ہش کیا۔ گویا وہ لڑکے نہ ہوں کوّے ہوں جو ان کے ہُش ہُش کرنے سے اڑ ہی تو جائیں گے۔ شاید انہوں نے یہ ایکشن ہماری تسلی کے لئے لیا تھا۔ قدرے توقف سے بولیں۔ پولیس والے ڈنڈا لے کر تو بیٹھے ہیں مگر کہتے ہیں کہ ان لڑکوں سے ہم پنگا نہیں لے سکتے۔ ویسے بھی غالباً ان کے پاس ڈنڈے نہیں بندوقیں ہیں۔ ڈنڈے تو لاٹھی چارج کے کام آبھی جاتے ہیں۔ ان کی بندوقیں بھلا کس کام کی؟

ہم نے تفہیمی انداز میں ہونقوں کی طرح سر ہلا کر میڈم کی بات سے اتفاق کیا اور بمشکل تمام دوبارہ کاپی کی طرف توجہ مرکوز کرنی چاہی۔ مگر یہ کیا!! ہم دھک سے رہ گئے کیونکہ اس طوفان بدتمیزی اور میڈم سے، پولیس کے کردار، پر مذاکرات میں ہم اپنے آنسوؤں کو قابو کرنا تو بھول ہی گئے تھے۔ صورت یہ تھی کہ آنکھ کا سمندر کاغذ پر لہریں مار رہا تھا۔ جو کچھ لکھا تھا وہ بھی دُھل دُھلا کر صاف ہو چکا تھا۔ اب رزلٹ کی فکر نہیں۔

واعظ کیے ڈرائے ہے روزِ حساب سے
گریہ مرا نامۂ اعمال دھو گیا

عقل بڑی یا بھینس

خالد رفیق انور

اس مضمون میں چند مفید مشورے دیئے جارہے ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے مسائل بھی حل ہوں گے اور آپ عقلمند بھی کہلائیں گے۔

○ ..... دوستو! اپنا قد تو آپ بڑھا نہیں سکتے لیکن ٹھہریئے! ذرا سوچئے۔ لیجئے ترکیب ہم سے سنئے۔

ٹین کے دو خالی ڈبے ایک ہی سائز کے لیں۔ پیندے میں سوراخ کر کے موٹا دھاگہ یا سُتلی باندھ لیں۔ سُتلی چار فٹ لمبی ہو۔ اس سُتلی کو انگوٹھے اور پیر کی انگلی کے درمیان چپل کی طرح پھنسالیں۔ ڈبوں پر کھڑے ہوجائیں اور چلنے کی کوشش کریں۔ ڈبوں سمیت چلنے کی کوشش سے آپ کا قد ڈبوں کی اونچائی کے برابر بڑھ گیا۔ ہے نا مزے کی بات! اونچی جگہ تصویر، گھڑی، کلینڈر ٹانگنا ہو۔ دیواروں، چھت کی صفائی کرنی ہو تو اس ترکیب سے مدد مل سکتی ہے۔

○ ..... گھر سے باہر گلی میں دیکھیں تو رنگ برنگی کالی، پیلی، نچی پھٹی، بدنما، پولی تھین کی تھیلیاں ہوا میں چڑیلوں کی طرح ناچتی، ماحول کو گندا، بدنما کرتی نظر آئیں گی۔ اسی طرح میٹھی چھالیہ، پان سونف

مسالہ، آئس کریم کے لفافے سب مل کر عجیب بے ہنگم منظر بن جاتے ہیں۔ یہ تھیلیاں گندے پانی میں آلودہ ہو کر اڑیں تو کپڑوں کو ناپاک کر دیں گی۔

ان چڑیلوں سے نجات بھی انہی کے ذریعہ ہوگی؟ لیجئے ہم سے سنئے۔ بھئی ایک بڑی تھیلی (شاپنگ بیگ) لے کو چند پتھر کے روڑے ڈالیں۔ پھر اس میں تمام لفافے چھالیہ کی پڑیاں، تھیلیاں، چیونگم کے کاغذ سب کچھ ڈال کر اس کا منہ بند کر دیں۔ روڑوں کے وزن سے تھیلی اڑ نہ سکے گی اب اسے کوڑا گھر کے حوالے کر دیں۔ لیکن دیکھیں بار بار اس زحمت سے بچنے کیلئے ایک اور تھیلی کا انتظام کر لیں جس میں اگلے روز یہ سب فالتو سامان جمع کرتے جائیں۔ ذرا سی محنت اور توجہ سے ماحول کتنا خوبصورت ہو گیا۔

لفافے دوبارہ استعمال کریں!

○ ..... دعوت ناموں کے لفافے کافی مہنگے خریدے جاتے ہیں۔ جب یہ گھروں میں پہنچتے ہیں تو بیکار ردی سمجھ کر ڈال دیئے جاتے ہیں کہ ان پر آپ کا نام لکھ دیا گیا۔ اک ذرا عقل پر زور دیں تو یہ دوبارہ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہم سے پوچھئے۔ خط بھیجنے کا پتہ الگ صاف کاغذ کی پٹی پر لکھ لیں اور اسے نام کے اوپر گوند یا لیئی سے چپکا دیں اب خط لفافہ میں ڈال کر بھیج سکتے ہیں۔ کیوں کیسی رہی؟

○ ..... بازار سے جن تھیلیوں، لفافوں میں سامان آتا ہے اسے دکاندار پیسہ لگا کر خریدتے ہیں اور سامان کے ساتھ اس کی قیمت لگا کر آپ کو دیتے ہیں جو آپ کو مفت معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہ لفافے تھیلیاں خالی کر کے کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کو سائز کے اعتبار سے الگ الگ جمع کرتے جائیں تہہ لگا کر صفائی سے رکھتے جائیں۔ بیس پچیس ہو جائیں تو پیکٹ بنا کر محلہ کے دکاندار یا پرچون یا سبزی والے کو دے دیں۔ وہ اس کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لے گا۔ آپ کے بل میں رعایت کرے گا۔

○ ..... پیکنگ کے ڈورے رسی، سُتلی، نائلون کے فیتے کھول کر پھینکنے کے بجائے الگ جمع کرتے جائیں کچھ عرصہ بعد ان کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے گا۔ ان کو باندھ کر مضبوط رسی، چارپائی کی اودوائین (پائنتی) کپڑے سکھانے کی الگنی، کمربند، دوسری کام کی چیزیں بن سکتی ہیں۔ دیہات میں تو ان کی بنی ہوئی چارپائیاں اور کھٹولے بھی دیکھے گئے ہیں۔

○ ..... نیا تعلیمی سال شروع ہو گیا۔ بچے اپنی پرانی کاپیاں کتابیں پھاڑ کر ادھر ادھر اڑا دیتے ہیں۔ یہی کتابیں آپ کے دوسرے بھائی بہنوں یا محلہ کے غریب بچوں کے کام آ سکتی ہیں جو مہنگی کتابیں خرید نہیں سکتے۔ کاپیوں کے سادہ صفحے ملا کر ایک کاپی بن سکتی ہے جو گھریلو حساب کی، دھوبی کی کاپی وغیرہ بن سکتی ہے۔ اس طرح والد کی کمائی کے پیسے بچائے جا سکتے ہیں۔ نیا بستہ خریدنے کے بجائے پرانے بستے کو دھو کر

مرمت کرا کے دوبارہ کام میں لایا جاسکتا ہے یا گھر کے کسی اور کام میں آسکتا ہے۔ مہنگی چیزیں پرانی سمجھ کر پھینک دینا عقل کی بات نہیں!

○ .... بازار جب سودا یا سبزی لینے جانے لگیں تو پڑوسن آنٹی سے پوچھ لیں "آپ کو کچھ منگانا ہے؟" اس طرح ایک ہی پھیرے میں دو گھروں کا سودا سبزی وغیرہ آسکتی ہے۔

○ .... باورچی خانے، غسل خانے، ڈرائنگ روم سے باہر نکلیں تو بتیاں بجھادیں۔ پنکھے بند کر دیں۔ ٹونٹی مضبوط بند ہے، دیکھ لیں۔ گیس آف کر دیں۔ بیکار گیس اور بجلی کا ضائع ہونا درست نہیں۔ اس طرح گیس، بجلی کا بل بھی کم آئے گا۔ تقریباً ل میں آدھی رات کے وقت یا بعد لوگ بتیاں روشن چھوڑ کر سو جاتے ہیں جو اگلے دن نو دس بجے تک جلتی رہتی ہیں۔ اگر انہیں سونے سے پہلے بند کر دیا جائے تو بجلی ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔

○ .... کپڑے پر روشنائی کا دھبہ لگ جائے تو گرم پانی سے نہ دھوئیں۔ پہلے اس پر لیموں، سرکہ یا پیاز کاٹ کر مل دیں اس سے سیاہی کا دھبہ ہلکا ہو جائے گا۔ پھر صابن یا کسی پاؤڈر سے دھو ڈالیں۔

○ .... چیونگم چبا کر ادھر ادھر چپکا دینے سے وہ مستقل وہیں چپک جاتا ہے پھر چھڑانے سے نہیں چھوٹتا۔ چیونگم چبانے کے بعد ہمیشہ کسی کاغذ میں لپیٹ کر ڈالیں تاکہ نہ چپکے۔ اگر چپک گیا تو اس پر برف مل کر کپڑے یا جسم سے چھڑالیں۔ آسانی سے چھوٹ جائے گا۔

○ .... گملے ٹوٹ جانے پر پھینک دیتے ہیں ان کی مٹی دوسرے گملوں میں ڈال دیں اور گملے کا نچلہ حصہ (پیالہ نما) رکھ لیں۔ اسے الٹ کر دوسرے گملوں کی ٹیک (SUPPORT) بنا سکتے ہیں۔ دوسرے گملے نہیں گریں گے۔

اسے پلو سے باندھ لیجیے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

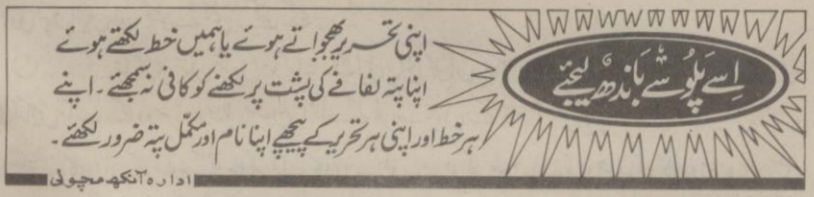

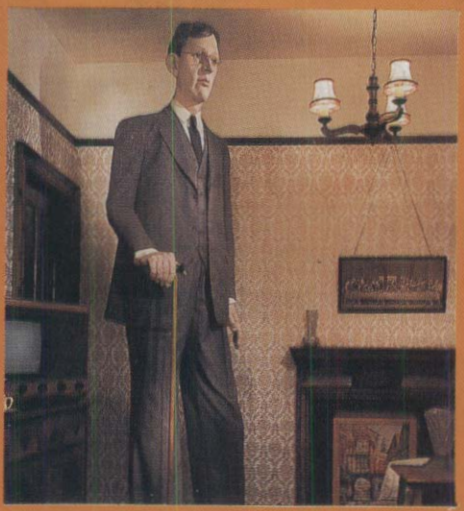

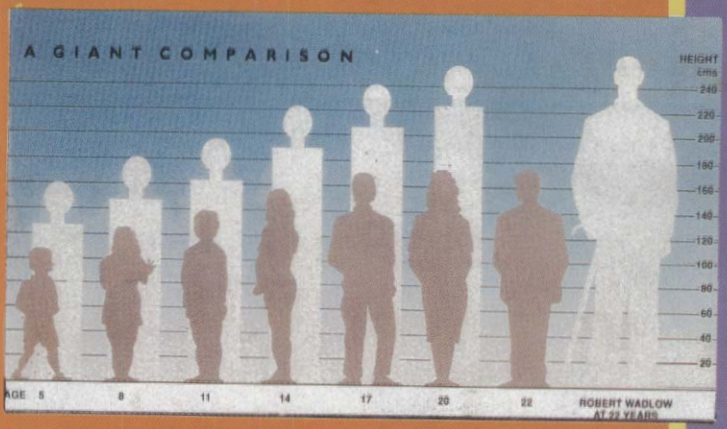

رابرٹ واڈلو

دنیا کا سب سے طویل القامت انسان

خالد خلیل

اوڈلی کا احتجاج

تحریر: ایلن ٹیمپرلی ، ترجمہ: سہیل احمد صدیقی

چائے کا (سابق) تاجر اور سدا کنوارا اوڈلی قصبے میں گھوم رہا تھا۔ قصبے کے گھنٹا گھر نے پونے چار بجائے تو اوڈلی چلتا چلتا اسلحہ کی ایک دکان پر رک گیا۔ جیمس ہیرس اینڈ سن..... اسلحہ ساز کی دکان (قائم شدہ ۱۸۷۲ء)، اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہ دکان میں آویزاں ایک ایک بندوق کا جائزہ لے رہا تھا۔ دکان دار نے جلد ہی بھانپ لیا کہ موصوف کوئی چیز خریدنے نہیں بلکہ محض دکان کی سیر کرنے آئے ہیں۔ اس نے اخلاقاً دریافت کیا۔ "جناب کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"ہاں....." کچھ سوچ بچار کے بعد اوڈلی خوابیدہ آواز میں گویا ہوا۔ "میں تمھیں بتاتا ہوں..... میں بندوقوں، رائفلوں اور اس طرح کے دیگر اسلحہ کی فروخت کا مخالف ہوں کیونکہ یہ جنگلی قازوں اور دوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کے کام آتا ہے۔" اب ہیرس کو یاد آیا کہ وہ "حیوان کش" کھیلوں کے اس مخالف کو قصبے میں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔

"ہاں..... یہ تمہاری رائے ہے۔" وہ بولا۔ "تمہیں اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔"
ہیرس بہت سنجیدہ تھا۔ "مگر اس وقت میں تم سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کو تیار نہیں، معافی چاہتا ہوں۔"

دکان دار تو اسے کسی بے وقوف بچے کی طرح نظر انداز کر کے اپنی مصروفیات میں مشغول ہو گیا اور اوڈلی نے اپنا چرمی تھیلا ایک طرف رکھا، پتھر اپنے ہاتھ میں لیا اور عجیب کھوئی ہوئی آواز میں دکاندار سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہاری دکان کی کھڑکی توڑ رہا ہوں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا!" اوڈلی نے جواب دیا۔ "کیا تم پاگل ہو؟" ہیرس اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا

"مگر یہ بات طے ہے کہ تمہاری کھڑکی توڑوں گا..... تم پولیس کو پہلے بلانا چاہتے ہو یا میری اس حرکت کے بعد۔"

تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو گھورنے کے بعد..... ہیرس ایک شکست خوردہ آہ بھرتے ہوئے، سر کو ذرا خم دے کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور ڈائریکٹری کو ہاتھ میں لیا۔ "آٹھ..... سات..... تین نو" اوڈلی نے خود ہی پولیس کا نمبر بتا کر اس کی رہنمائی کی۔

کچھ دیر کے بعد قصبے کا پولیس سارجنٹ اور ایک نوجوان کانسٹیبل کار سے بر آمد ہوئے۔ دونوں پولیس والے ہجوم کے درمیان راستہ بناتے ہوئے دکان تک پہنچے، سارجنٹ ہیرس سے گفتگو کرنے لگا، جبکہ کانسٹیبل اوڈلی پر قابو پانے کی تیاری کرنے لگا۔ جوں ہی وہ تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھا، اوڈلی نے بھانپ لیا کہ اب اس کے پاس مزید وقت نہیں۔ پولیس والے نے اوڈلی کا شانہ چھوا تو اس نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور پتھر تیزی سے کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔

اب اس حسن اتفاق ہی سمجھنا چاہئے کہ پتھر دکان کے مرکزی شیشے پر جا لگا اور کھڑکی ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

ہیرس غصہ میں بھرا آگے بڑھا اور اپنے برساتی کوٹ کی مدد سے اوڈلی کو پکڑ لیا، اس کا چہرہ غصے کی شدت سے دمک رہا تھا۔ سارجنٹ نے اوڈلی کو دکان دار کے گلابی ہاتھوں سے چھڑا کر اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑ لیا۔

دن کے سوا گیارہ بجے اوڈلی، شیرف کی سرسری سماعت کی عدالت میں پیش ہوا جو تھانے سے محض سو گز پرے واقع تھی۔ "جناب والا!....." اس نے لرزتی ہوئی آواز میں بیان پڑھنا شروع کیا۔ "ہر سال....." ایک مرتبہ پھر اس نے گلا صاف کیا، لمبا سانس لیا اور پھر گویا ہوا۔ "جناب والا ہر سال اکتوبر کے

اواخر میں سرمئی قازیں، میرے گھر سے نصف میل دور، دریائے ڈگلس پر آکر جمع ہوتی ہیں۔ وہ اسپٹز برجن اور بحر منجمد شمالی سے جنوب کی سمت، اس مقام کے لئے پرواز کرتے ہیں۔ مگر ان کی یہاں آمد سے موسم بہار میں روانگی تک، انہیں گولیوں کا نشان بنایا جاتا ہے، ذبح کیا جاتا ہے، زخمی کیا جاتا، اور ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو اس کو کھیل سمجھتے ہیں۔ کچھ قازوں کو بطور غذا ذبح کر کے کھانا تو درست ہے مگر تمام قازوں کو مارنا اور ذبح کرنا کہاں کی دانش مندی ہے..... اگر لوگوں کو بندوقیں اور دیگر اسلحہ فروخت کرنے کی اور اس سے منافع کمانے کی آزادی نہ ہوتی تو قازیں اور دوسرے جنگلی جانور اس بُری طرح ہلاک اور زخمی نہ ہوتے، چنانچہ میں نے ہیرس کی دکان کی کھڑکی محض اپنا احتجاج ظاہر کرنے کے لئے توڑ دی۔"

کمرۂ عدالت میں سکوت طاری تھا اور لوگ اوڈلی کے ہم نوا بنتے نظر آتے تھے، ایک مقامی صحافی بڑی تیزی سے اس کا بیان اپنی بیاض میں نقل کرنے میں مصروف تھا۔

اوڈلی کے بیان کے اختتام کے محض ایک یا دو منٹ کے بعد شیرف نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے غیر روایتی انداز میں، اوڈلی کے نفسیاتی معائنے کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اس کے احساسات کو سراہا، تاہم ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیا کہ احتجاج کا یہ طریقہ نامناسب ہے اور غیر قانونی بھی۔ اس نے اوڈلی کو ہرجانے کی ادائیگی کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر اوڈلی کا وکیل کھڑا ہوا، مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اوڈلی بھی کھڑا ہو گیا۔ "نہیں..... معاف کیجئے..... میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے..... جوں ہی ہیرس کی دکان کی کھڑکی ٹھیک ہوگی، میں اسے پھر توڑ دوں گا اور میں اس کا ہرجانہ بھی ادا نہیں کروں گا۔"

اوڈلی نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات ختم کی اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" شیرف بہت سنجیدہ تھا۔ "اگر تم نے یہی طرزِ فکر اور انداز گفتگو برقرار رکھا تو میں تمہیں توہین عدالت کا مرتکب قرار دوں گا، جو کہیں زیادہ خطرناک معاملہ ہے، ذرا احتیاط سے کام لو۔" "مجھے تو جو کرنا تھا کر چکا۔ میرا مقصد جناب والا آپ کی عدالت عالیہ کی توہین ہرگز نہیں، اگر میں ہرجانہ دوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے مجھے تو اسے بھول کر اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ میرے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں، میں خود کو تیار کر چکا ہوں۔"

اور یوں..... چائے کے سابق تاجر، کلیسا کے بزرگ، شوقیہ باغبان، سنسنی خیز کہانیوں اور رومانوی ادب کے دلدادہ..... اوڈلی صاحب کو جیل میں چودہ دن قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ تریسٹھ برس کی عمر میں اس کا کردار جرم سے داغ دار ہوا۔

اس کا مقدمہ جیل کی موٹی دیواروں سے نکل کر ورکشاپ، ڈائننگ ہال اور تفریح گاہوں تک بہت اہمیت اختیار کر گیا، جہاں حریت پسند عوام نے اسے چیمپئن بنا دیا۔

فروری کی ایک چمکیلی صبح اس نے جیل کو خیرباد کہا۔ ایک پولیس وین نے اسے گھر کے نزدیک اتار دیا۔ جب وہ اپنی آزادی سے لطف اندوز ہوتا ہوا گلیوں سے گزر رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ جیمس ہیرس اینڈ سن کی دکان کی کھڑکی کی مرمت ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ اس کا شیشہ پھر توڑ دے، مگر یہ سوچ کر باز رہا کہ جیل والوں نے اس اقدام کے دوبارہ ارتکاب کی صورت میں چھ ماہ قید کی دھمکی دی تھی۔ جب وہ شام کے وقت پاجامہ اور گاؤن میں ملبوس کسٹرڈ کریم بسکٹ کے ساتھ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا، نیلا یونی فارم پہنے ایک پولیس والا اس کے آرام میں مخل ہوا۔ نوجوان کانسٹیبل بہت سخت گیر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اوڈلی کو کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ اوڈلی صاحب اسی دن صبح کے وقت جیل سے رہا کئے گئے تھے اور اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ انہوں نے گزشتہ دو گھنٹے کہاں گزارے، کیوں کہ..... ہیرس کی دکان کی کھڑکی کا شیشہ ایک اینٹ سے توڑ دیا گیا تھا، مگر یہ کوئی مسئلہ نہ تھا، اوڈلی کی بے گناہی بالکل واضح تھی۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو موسم سرما کا ایک اور حسین دن اس کا منتظر تھا اور ہیرس کے دکان کی کوئی کھڑکی ایسی نہ تھی جو ٹوٹنے سے رہ گئی ہو۔ اوڈلی نے ناقابل بیان فرحت محسوس کرتے ہوئے گیراج سے کار باہر نکالی اور اپنا سوٹ کیس قدموں میں رکھ لیا۔ وہ گھر کو مقفل کرنے کے لئے پلٹا تو جنگلی قازوں کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آسمان پر قازوں کے دو غول نمودار ہوئے اور کھیتوں پر پرواز کرتے ہوئے تیزی سے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں
پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجیے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

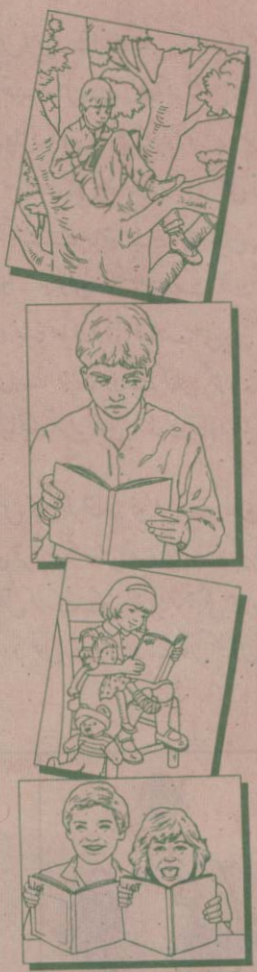

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھیے۔
- دیگر ممالک کے لیے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی — ڈی-۱۱۲، سائیٹ کراچی

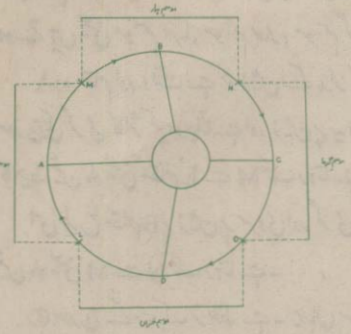

ہمارا ٹھکانہ

ایاز احمد

اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے زمین بنائی۔ زمین جو ایک گول گیند کی مانند ہے، سورج کے گرد اسے ہر جانب سے دیکھتی ہے۔ سورج جو ایک دہکتا ہوا گولا ہے۔ کائنات میں موجود سردی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سورج کے گرد گھومنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے زمین کا ایک مدار مقرر کر دیا ہے۔ اس مدار پر زمین گھومنے کے ساتھ ساتھ ہر لمحہ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کے قائم کردہ ایک عیسوی سال (۳۶۵٫۲۵ دن) میں زمین اس مدار پر ایک چکر مکمل کرتی ہے۔ زمین کے گھومنے پر جو زمین کا حصہ سورج کے سامنے ہو گا وہ روشن ہو گا اور پچھلی سمت میں موجود حصہ پر اندھیرا ہو گا۔ زمین کے مسلسل گھومنے پر زمین کا پچھلا حصہ تقریباً بارہ گھنٹوں میں سورج کے سامنے آکر روشن ہو جاتا ہے جبکہ روشن حصہ گھوم کر بارہ گھنٹوں میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک مقرر حصہ تقریباً چوبیس گھنٹوں میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اس طرح دن رات کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ زمین سورج کے گرد جس مدار پر گھومتی ہے وہ بالکل ایک گول دائرہ ہے مگر سورج اس مدار کے بالکل مرکز میں نہیں ہے۔ اس طرح زمین سورج سے ہر لمحہ مختلف فاصلہ پر ہوتی ہے۔ اگر زمین مقام (A) پر موجود ہے تو مقام D, C, B یا کسی اور مقام سے زمین کا سورج سے فاصلہ مقام A سے زمین اور سورج کے درمیانی فاصلہ سے مختلف ہو گا۔

آج کل بتایا یہ جاتا ہے کہ سورج کے گرد زمین کا مدار انڈے کی مانند بیضوی ہے جبکہ ہر گز ایسا نہیں ہے۔ اگر ایک مقرر وقت پر سال میں زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ ناپا جائے تو وہ اتنا ہی ہو گا جتنا پہلے

تھا۔ تصویر میں آپ سورج کے گرد زمین کا مدار دیکھ سکتے ہیں۔ جو اندازاً بنایا گیا ہے۔ زمین اپنے مدار پر چلتی ہوئی کبھی سورج سے دور ہوجاتی ہے تو کبھی نزدیک۔ دور ہونے پر زمین پر سورج کی گرمی کا اثر کم ہوجاتا ہے اور نزدیک ہونے پر سورج کی گرمی کا اثر زیادہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح زمین پر چار موسم ظاہر ہوتے ہیں یعنی موسم سرما، موسم بہار، موسم گرما اور موسم خزاں۔

A وہ مقام اور وقت ہے جو زمین کے مدار کا سورج سے دور ترین نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچنے پر سورج کی گرمی کا اثر کم ہوجاتا ہے اور زمین پر یہ وقت موسم سرما کا سرد ترین وقت ہوتا ہے۔ موسم گرما کا حیطہ تین ماہ یعنی مقام L سے M تک رہتا ہے۔

اسی طرح مقام B پر زمین پر سردی اور گرمی کی مقدار مناسب ہوتی ہے یہ موسم بہار کا ہوتا ہے اور تین ماہ یعنی M سے N تک رہتا ہے۔

C سورج کے نزدیک تر نقطہ ہے۔ جہاں سورج کی گرمی کائنات کی زمین پر موجود سردی پر چھا جاتی ہے۔ یہ موسم گرما ہوتا ہے اور مقام N سے O تک رہتا ہے۔

D مقام پر جب زمین پہنچتی ہے تو ایک موسم یعنی خزاں آجاتا ہے یہ موسم O سے L تک یعنی تین ماہ تک رہتا ہے اس میں گرمی اور سردی اپنی مناسبت سے نہیں ہوتیں۔ A، B، C اور D وہ مداروی اوقات ہیں جن پر زمین جب پہنچتی ہے تو ان سے متعلق موسم اپنے جوبن پر ہوتے ہیں۔ اب سنئے زمین کی گردش کا حال:۔

زمین جب L پر گھومتی ہوئی پہنچتی ہے تو سردی کا آغاز ہوتا ہے۔ A پر سردی تیز تر ہوجاتی ہے۔ A سے آگے بڑھتے ہوئے سردی کم ہونے لگتی ہے اور M پر اس کی شدت کم ہوجاتی ہے۔ M سے بہار کا خوشگوار آغاز ہوتا ہے اور B سے N تک یہ موسم قائم رہتا ہے۔ N سے اب گرمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ گرمی بڑھتی ہوئی C پر شدت اختیار کرلیتی ہے اور پھر O کی طرف آتے ہوئے کم ہونے لگتی ہے۔ O سے موسم خزاں شروع ہوتا ہے اور D سے L مقام تک رہتا ہے۔

زمین کی سطح بالکل برابر نہیں اس میں کہیں وادیاں ہیں تو کہیں پہاڑی مقامات اور زیادہ تر میدانی علاقے ہیں۔ اونچے مقامات پر موسم مختلف رہتے ہیں مثلاً گرمیوں میں پانی کے بخارات بادل بن کر ان مقامات پر چھائے رہتے ہیں اور زیادہ اونچائی تک نہیں جاسکتے۔ ان بادلوں سے نمی برقرار رہتی ہے اور موسم خوشگوار بن جاتا ہے۔ جبکہ موسم سرما میں سردی کی شدت ہوتی ہے۔ ان مقامات پر بادلوں کی وجہ سے ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے۔ زمین کی مناسب سطح سے نیچے والے مقامات پر موسم شدید رہتا ہے۔ اس طرح مناسب سطح والے مقامات پر موسم بھی مناسب ہوتا ہے۔

ٹیڑھی اینٹ

سید ثمینہ اختر سیمی

"شوکی! شوکی بیٹا! ذرا ادھر تو آنا۔" فیروز آنٹی نے اپنے گھر کے دروازے سے باہر جھانک کر پکارا۔ شوکی گلی کی نکڑ سے دونوں ہاتھوں سے خیالی موٹر سائیکل بنائے ہوئے بھاگا اور فیروز آنٹی کے گھر کے سامنے ہی رک کر اچانک بریک لگائی۔ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ وہ گرتے گرتے بچا۔

"یہ لو دس روپے بیٹا! احمد گھر پر نہیں ہے ذرا بھاگ کر حلوائی کی دوکان سے برفی تو لے آؤ۔ مہمان آئے بیٹھے ہیں، شاباش بھاگ کر جانا!" فیروز آنٹی نے آنکھوں میں ڈھیروں محبتیں سمیٹے بڑے پیار سے کہا تو شوکی نے گردن اکڑا کر پھر اپنی فرضی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرن ڈرن کی آوازیں نکالتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فیروز آنٹی دروازے پر ہی کھڑی تھیں کہ چند منٹوں میں شوکی نے برفی کا لفافہ فیروز آنٹی کو لا تھمایا۔ اور واپسی کے لئے مڑا ہی تھا کہ آنٹی پیار

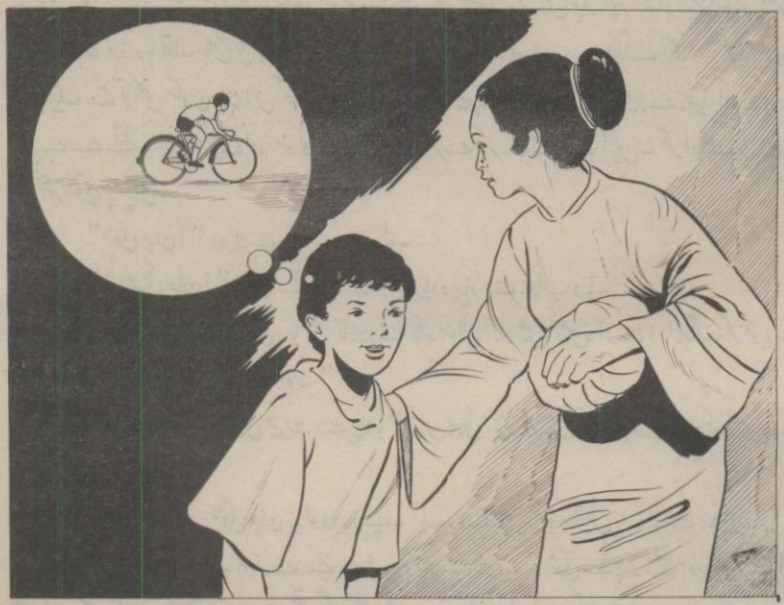

سے بولیں۔

"اے شوکی بیٹا یہ لو!" انہوں نے ایک روپے کا نوٹ شوکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب کیا لاؤں؟" شوکی نے معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔ یہ تیرا انعام ہے رکھ لے شاباش!" فیروزہ آنٹی نے پھر بڑے پیار سے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

شوکی کافی دیر روپیہ ہاتھ میں لئے سوچتا رہا کہ رکھوں یا واپس کر دوں کہ اچانک اس کی نگاہوں میں فالسے ناچنے لگے... کالے کالے فالسے۔ فیصلہ پل بھر میں ہو گیا تھا۔ اس نے فالسے خریدے اور ٹاٹ ہٹا کر اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ شوکی کی امی صحن میں ایک کونے میں لگے نلکے کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھیں۔ بڑے بھیا اپنے کمرے میں بند امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ جب کہ رشیدہ اور منو کچے صحن میں لگے نیم کے درخت پر رسی سے بنے جھولے پر باری باری جھول رہے تھے۔ منو نے زور سے رشیدہ کو جھولے پر بٹھا کر دھکا جو دیا تو رشیدہ منہ کے بل زمین پر جا گری اس کے منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا دو دانت ٹوٹ کر مٹی میں گم ہو گئے تھے۔ منو خوفزدہ ہو کر درخت سے چمٹ گیا۔ اماں نے جلدی جلدی رشیدہ کے منہ کو اپنے دوپٹے سے صاف کیا اور منو کو درخت سے گھسیٹ کر تین چار تھپڑ جما دیئے۔ منو جو پہلے ہی خوف سے لرز رہا تھا۔ ماں کی آنکھوں میں خون اترا دیکھ کر زور زور سے چلّانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے ایک لمحے کو بھی سکون ہے اس گھر میں پتا نہیں ہے کہ میرے امتحان سر پہ ہیں" بڑے بھیا چلّاتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ اماں رشیدہ اور منو کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ مگر اچانک بڑے بھیا کی نظر شوکی پر پڑی۔

"شوکی جان!" وہ بڑے پیار سے بولے۔

"جی بھائی جان!" شوکی نے اس سے بھی زیادہ پیار سے جواب دیا۔

"دیکھو شوکی جان میرا صبح ریاضی کا پیپر ہے کچھ سوال سمجھ میں نہیں آ رہے ذرا بھاگ کر نوید کے گھر جاؤ اور اس سے خلاصہ تو لے آؤ۔"

"نوید کے گھر"! شوکی حیرت سے چلایا "نہیں بھائی اتنی دور میں نہیں جاؤں گا، دیکھ نہیں رہے کتنی گرمی پڑ رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں شوکی جان یہ لو دو روپے۔ ایک روپے میں شمو سائیکل والے سے سائیکل کرائے پر لے لینا اور ہاں دوسرا روپیہ تمہارے لئے ہے اب تو جاؤ گے ناں۔" شوکی نے چند لمحے سوچا اس کے دل میں اب بھی فالسوں کی طلب ہو رہی تھی مگر مٹھی میں صرف چند دانے رہ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے نکالیں دو روپے میں ابھی جاتا ہوں۔" شوکی نے روپے ہاتھ میں پکڑے اور گلی کی نکڑ پر کھڑے ریڑھی والے سے ایک روپے کے اور فالسے خریدے اور شمو سائیکل والے کی دوکان کی طرف چل پڑا۔ شمو سائیکل والا سخت گرمی میں ہاتھ سے پنکھا جھل رہا تھا۔ سائیکل لینے کے بعد شوکی جانے کو مڑا ہی تھا کہ شمو سائیکل والے نے پیچھے سے آواز دی۔

"اوئے شوکی بادشاہ ذرا ٹھہر تو سہی!"

شوکی نے سائیکل پر پاؤں چلانے بند کر دیئے اور واپس مڑ کر بولا۔

"جی چاچا جی۔"

"اوے شوکی تو بڑی سڑک پر ہی جا رہا ہے ناں۔"

"ہاں چاچا جی!" شوکی نے ادب سے جواب دیا۔

"بیٹا دیکھ دن کے دو بج گئے ہیں ابھی تک بھورا میری روٹی لے کر نہیں آیا واپسی پر میرے گھر سے کھانا لیتے آنا اور ہاں بھورے کے اماں سے کہنا میں آج دیر سے آؤں گا۔"

"جی اچھا کہہ دوں گا۔" شوکی نے ادب سے جواب دیا اور پھر جانے کو مڑا ہی تھا کہ شمو سائیکل والے نے اپنی گدی کے نیچے سے ایک اٹھنی نکالتے ہوئے شوکی کو پکڑایا۔

"یہ لے رکھ لے راستے میں قلفی کھا لینا۔ شاباش اب جا۔"

شوکی نے قلفی کا تصور کرتے ہی اٹھنی جھپٹ لی اور تیزی سے موڑ مڑ گیا۔

زندگی کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ شوکی تمام محلے والوں کیلئے رحمت کا فرشتہ بنا ہوا تھا۔ چاچا کرمو کو جب بھی حقہ تازہ کرنا ہوتا وہ شوکی کو آواز دیتا۔ اور شوکی جھٹ حاضر جلدی سے حقہ تازہ کرتا ادب سے سلام کرتا اور چاچا کرمو خوشی خوشی ایک اٹھنی اس کی جیب میں ڈال دیتا۔ مونا اور شینا تو اکثر شوکی ہی سے رسالے منگواتی تھیں اور گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھیں۔ اور شوکی میاں کو فی رسالہ ایک روپیہ انعام میں وصول ہو جاتا۔ اکبر تایا کے گھر اکثر بلی مرغی کے چوزوں کو کھا جایا کرتی تھی اکبر تایا کے چوزوں کی حفاظت بھی شوکی میاں کے ذمہ تھی۔ وہ ہر وقت ان پر کڑی نظر رکھتا۔ جس کے نتیجے میں اکبر تایا اسے گاہے بگاہے اپنی دوکان سے پتنگیں مفت دیا کرتے تھے۔ غرض شوکی محلے بھر کی ضرورت تھا اور محلے بھر کے لوگ اس کی خدمات کے عوض اسے انعام دینا نہ بھولتے۔ اماں واری کے گھر جب بھی دیگ پکتی تو شوکی ہی چاول سب گھروں میں تقسیم کرتا تھا اور اماں واری۔ صدقے واری ہوتے ہوئے پانچ کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیتیں۔

دن گزرتے گئے بڑے بھیا ایم اے کرنے کے بعد ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ رشیدہ اور

منو بالترتیب آٹھویں اور ساتویں کلاس میں تھے جبکہ شوکی ابھی تک میٹرک میں مسلسل فیل ہو رہا تھا۔ آخر کار بڑی مشکل سے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کیا تو بڑے بھیا نے فوراً اپنے دفتر میں کلرک لگوا دیا۔ شوکی کے لئے یہ نیا ماحول تھا نئے لوگ تھے اسے کسی چیز کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی بہر حال چند ہی دنوں میں وہ اس کا عادی ہو گیا۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے شوکی نے جلدی جلدی فائلیں سمیٹیں اور کرسی گھسیٹ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ "ٹھہریئے شوکت صاحب!" ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے سر اٹھا کر دیکھا "سیٹھ صاحب آپ!" شوکی حیرت سے بولا۔ اس کے سامنے ایک مشہور تعمیراتی کمپنی کا مالک کھڑا تھا۔ شوکی اس سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنے بلوں کی وصولی کے سلسلے میں اکثر دفتر آیا کرتا تھا۔

"آپ نے کیوں زحمت کی آنے کی۔ آیئے تشریف رکھئے!" شوکی نے نہایت ادب سے کہا۔

"بھئی شوکت میاں! اپنی غرض سے آئے ہیں۔ بھئی اب جلدی سے ہماری فائل آگے بڑھاؤ کام رکا پڑا ہے۔" سیٹھ صاحب نے کہا۔

"جی ضرور ضرور۔ دیکھئے کام بڑا مشکل ہے ذرا محنت کرنی پڑے گی آپ تو جانتے ہیں آج کل کے حالات۔" شوکی نے کہا۔

"میاں حالات کا رونا کہاں تک روئیں۔ یہ لو اپنا انعام۔ ہاں کام ہو جانا چاہئے۔" سیٹھ صاحب اٹھ کر چل دیئے۔ شوکی نے دراز میں رکھے ہزار ہزار کے پانچ نوٹوں کو دیکھا جو سیٹھ صاحب نے بڑی مہارت سے اس کی دراز میں ڈال دیئے تھے۔ جس چیز کی کمی وہ محسوس کر رہا تھا وہ پوری ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ دراز سے نکل کر اپنی جیب کے اندر چلا گیا۔ "سیٹھ صاحب کے کام میں واقعی بہت دیر ہو گئی ہے!" وہ بڑبڑایا۔

بیمہ

ایک انشورنس ایجنٹ نے مجاز کو بیمہ زندگی کے بے شمار فوائد بتا کر کہا "مجاز صاحب کیا آپ یہ نہیں پسند کریں گے کہ آپ کے بیوی بچوں کو یک مشت دس لاکھ روپے مل جائیں تاکہ وہ اطمینان سے زندگی بسر کریں۔" مجاز نے یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا "یقیناً میں یہ پسند کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے بیوی بچے کون دے گا آپ یا آپ کی کمپنی؟"

رام راج کو روک لو

تسکین زیدی، کانپور بھارت

آج وہ اداس اور بے چین بیٹھا ہوا اسکول کی ایک ایک چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ منظر اب کچھ لمحوں میں اس سے روپوش ہو جائے گا۔ اس جدائی کے احساس نے اس کے دل کا سکون منتشر کر دیا تھا۔

وہ تب چونکا جب آفس کے پردیپ بابو نے اسے پکار کر کہا "کہاں کھوئے ہوئے ہو رام راج دادا؟ وقت ہو گیا ہے گھنٹی بجاؤ ورنہ پرنسپل صاحب ناراض ہوں گے۔"

وہ بوجھل قدموں سے اٹھا اور گھنٹی بجانے لگا۔

"ٹن۔۔ ٹن۔۔ ٹن۔۔" گھنٹی بج اٹھی۔

لڑکے ایک کلاس سے دوسری کلاس میں آنے جانے لگے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کا موضوع یہی گھنٹی کی آواز تھی۔

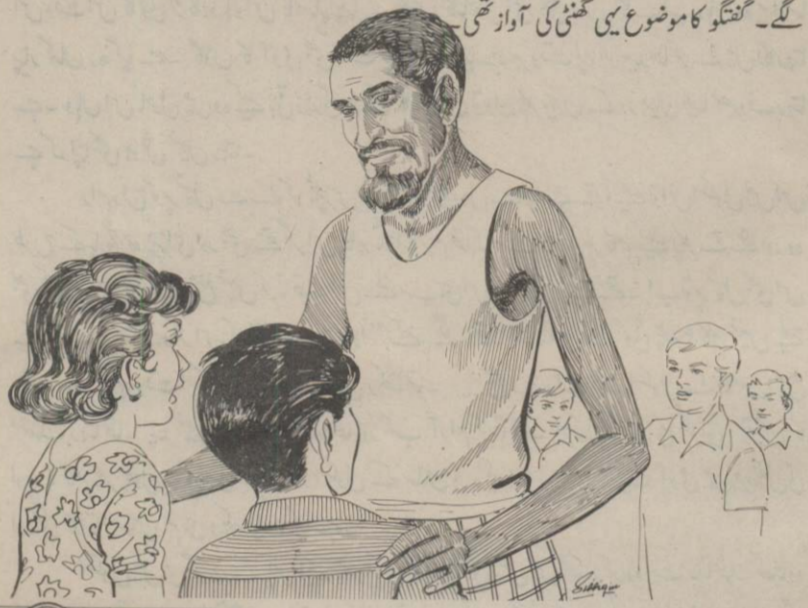

"آج یہ گھنٹی کی آواز کو کیا ہو گیا ہے، عجیب سی گھٹی گھٹی سی آواز ہے جیسے کسی نے سو کر یا رو کر اسے بجایا ہو۔ کیا رام راج نے سوتے سے اٹھ کر گھنٹی بجائی ہے؟" ۔

وہ یہ سرگوشی سن کر چونک پڑا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔

"ٹھیک کہو ہو بچّو!! اب تو میں بہت تھک گیا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں...... اس اسکول میں میرا آج آخری دن ہے کل میں کہاں ہوں گا اور یہ کہاں؟ تم لوگ بھی مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔ اس احساس نے میرے ہاتھوں کی مانو جان ہی نکال لی ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے جب گھنٹی بجائی جائے گی تو یوں یہی مدھم سی آواز نکلے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا اور خیالوں میں کھو گیا۔ اس کے تیس برس اس اسکول میں گزرے ہیں اور آج اس سے جدا ہوتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے کہ اب اس سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں رہ گیا ہو۔ اب تو باقی زندگی گاؤں کے چھپرے گھرے کچے بوسیدہ مکان میں گزرے گی۔ پینشن ضرور ملے گی مگر وہ اتنی کم ہوگی کہ دونوں وقت کا کھانا بھی مشکل سے بن پائے گا اور پینشن ملنے میں بھی سال بھر لگ جائے گا۔ فنڈ تو لڑکی کی شادی میں ہی ختم ہو چکا ہے باقی بیوی کی بیماری کھا گئی۔ کاش کہ اس وقت اس کا کوئی لڑکا ہوتا تو اس کا سہارا بنتا...... گاؤں کا ماحول بھی کافی بدل چکا ہے اب وہاں وہ پہلا سا پیار کہاں رہ گیا ہے۔ گاؤں کا آدمی بھی بہت چالاک ہو گیا ہے ہر وقت اپنا الو سیدھا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہاں اس ماحول میں وہ کیسے باقی زندگی بتا سکے گا؟ یہاں تو دن بھر بچوں کے درمیان ایسا مصروف رہتا ہے کہ اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔

رام راج کو پرنسپل سے لے کر ٹیچرس اور طلباء سبھی دل سے چاہتے تھے ویسے تو اس اسکول میں اس طرح کے پانچ چھ چپڑاسی اور بھی تھے مگر اس کا برتاؤ اتنا نرم تھا کہ سب اسی کو ہر کام کیلئے پکارتے تھے اور وہ بھی کسی کو کسی کام کیلئے منع نہیں کرتا تھا۔ اس لئے سب ہی اس کا خیال رکھتے تھے۔ اب تو پرنسپل بھی اس کے کام سے متاثر ہو کر اس کو "رام راج دادا" کہنے لگے تھے۔ اب اس سے کوئی چھوٹا کام نہیں لیتے تھے۔ وہ بھی ہر وقت اسکول کی بھلائی کا خیال رکھتا تھا۔ ...... صبح سے رات تک اسکول کے کاموں میں منہمک رہتا تھا۔ پتہ نہیں کب کھانا کھاتا تھا اور کب آرام کرتا تھا۔ اسکول گیٹ کی نگرانی، آفس کا اوپر کا کام پھر پھول پودوں کی سینچائی، اور اسکول کے سامان کی دیکھ بھال............ ایک آدمی میں فرائض کی ادائیگی کا اتنا احساس کم ہی دیکھا یا سنا گیا ہے۔

اسکول میں ہی گیٹ کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں تھک کر وہ لیٹ جاتا تھا۔ کھانا وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے پکاتا تھا...... معمولی کپڑا پہنتا۔ دھوتی اور بنیان میں ہی اس نے اپنی ساری زندگی

کاٹ دی..... کبھی کسی نے اسے پیروں میں چپلیں یا جوتا پہنتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ بڑا ایماندار تھا۔ کبھی کسی کی کوئی چیز کہیں بھولے سے رہ جاتی تو وہ اسے اٹھا کر رکھ دیتا تھا یا آفس میں جمع کر دیتا تھا۔ پھر اس کی یہ کوشش بھی رہتی تھی کہ جس کی چیز ہے اس تک جلد سے جلد پہنچ جائے۔

ایک بار کلاس میں کسی لڑکے کا پرس رہ گیا۔ وہ کسی مالدار گھرانے کا تھا اس میں ڈھائی سو روپے تھے۔ رام راج جب شام کو کمرہ بند کرنے آیا تو اسے میز پر یہ بٹوہ پڑا ہوا ملا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور دوسرے دن اس لڑکے کو ڈھونڈ کر دے دیا۔ اس نے خوش ہو کر اسے دس روپے کا نوٹ انعام میں دینا چاہا تو وہ ناراض ہو کر بولا..... "جاؤ بچّہ! خوش رہو۔ تم میرے بچے ہو کوئی اپنے بچوں سے بھی بخشیش لیتا ہے۔"

ایک لڑکی کا سونے کا کان کا بالا بھی گر گیا تھا اسے بھی اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ دوسرے دن جب اس کے ڈیڈی اسے پہنچانے آئے اور انہوں نے بالے کے بارے میں اس سے پوچھا تو رام راج نے آفس سے لا کر اسے بالا دے دیا۔ لڑکی کے باپ بھی اسے کچھ انعام میں دینا چاہتے تھے۔ ان سے اس نے بڑی عاجزی سے کہا "انعام کیسا صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔"

اس طرح اس نے سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ سبھی لوگ اس کے کردار کی ان ہی خوبیوں کے سبب اسے بہت چاہتے تھے اور جب اس کی لڑکی کی شادی گاؤں میں ہوئی تو لوگوں نے اسے سیکڑوں روپے کے تحفے اور سامان دے دیا اور اس کی لڑکی بڑی شان سے بیاہی گئی۔

آج رام راج کی اداسی کا سبب یہ تھا کہ وہ تین برس کی خدمت انجام دینے کے بعد اسکول کی نوکری سے ریٹائر ہو رہا تھا۔ اسے اسکول کی ایک ایک چیز سے یوں لگاؤ تھا جیسے یہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ہو۔ اگر کسی حصے پر ذرا سی چوٹ بھی پہنچتی ہے تو وہ زخمی ہو جائے گا۔ اسکول کی چابیوں کے گچھے کو وہ اپنے سینے سے یوں لگائے رکھتا تھا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو چمٹائے رکھتی ہے۔ آج وہ بھی اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے زمانے میں کبھی اسکول میں چوری کی کوئی چھوٹی سی واردات بھی نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے چپڑاسیوں کو بھی سمجھاتا رہتا تھا کہ "دیکھو جیسے اپنے گھر کا خیال رکھتے ہو ویسے ہی اسکول کی ہر چیز کی نگرانی رکھا کرو۔ جس اسکول سے تمہاری روزی روٹی جُڑی ہے اس کیلئے تمہیں ایماندار رہنا چاہئے۔"

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اسکول کے ہال میں رام راج کی الوداعی پارٹی کا انتظام ہو رہا تھا۔ طلبہ میں بھی اس کیلئے بڑی محبت اور احترام کا جذبہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے ہوئے اس کے منتظر تھے اور اس کے کارناموں کو دُہرا رہے تھے۔

"آج رام راج دادا ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اسکول تو ان کے بغیر سونا ہو جائے گا۔" کسی نے کہا.....

"ہم لوگوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میرا رکشے والا نہیں آیا تو انہوں نے مجھے اپنی کوٹھری میں بٹھالیا تھا۔ پھر گھر فون کروا کے بھائی کو بلوایا تو میں گھر جاسکا۔" ایک آواز آئی۔

"اور مجھے تو ایک دن وہ گھر پر چھوڑنے گئے تھے۔ اس دن زوردار بارش ہو رہی تھی بجلی بھی چلی گئی تھی۔ ہمارا نوکر اس دن بارش کے سبب لینے نہ آسکا تھا۔ اسکول گیٹ پر کوئی رکشہ بھی نہیں ملا تو وہ دور سے رکشہ لے کر آئے پھر مجھے گھر چھوڑنے گئے۔" دوسری آواز ابھری۔

"اور نیلم کو تو انہوں نے باہر کے شرارتی لڑکوں سے بچایا تھا۔ یہ کام انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیا تھا۔ کیا کوئی اس واقعہ کو بھول سکتا ہے؟"۔

ہال میں شور وغل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پرنسپل صاحب وہاں آگئے اور جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ سبھی کی نظریں رام راج کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ تھکے قدموں سے چل کر ہال کے دروازے پر گم سُم بیٹھ گیا۔ اس کی ویران آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

پرنسپل نے پاس آکر اس سے نہایت نرمی سے کہا۔ "یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ آج تمہاری جگہ یہاں نہیں وہاں ہے....." انہوں نے اندر اسٹیج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کی بانہیں پکڑ کر ہال میں لے آئے اور زبردستی اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بٹھادیا۔

"حضور! میں تو آپ کا نوکر ہوں" وہ آہستہ سے بولا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ پرنسپل نے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔

رام راج نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا پتہ نہیں وہ کیوں کانپ رہا تھا۔ اس قدر و منزلت کیلئے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آنسو اس کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے تھے اور دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"دادا رام راج! تم تو اس سے بھی زیادہ عزت کے مستحق ہو۔ اسکول کیلئے تمہاری خدمات کیا یہ اسکول ٹیچرس اور طلبہ آسانی سے بھلا سکیں گے؟ کبھی نہیں..... ہمیں تم پر ناز ہے ہمارے بچوں کو تمہاری مثالی زندگی سے سبق لینا چاہئے۔" پرنسپل صاحب بولتے بولتے رکے اور پھر انہوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آج جو یہ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں تو ہم کیوں ان کی عزت کر رہے ہیں؟ یہ عزت ان کی نہیں ان کے کام کی ہے، ان کی ایمانداری، محنت اور لگن کی ہے۔" پھر وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"لو یہ ہماری جانب سے چھوٹا سا تحفہ قبول کرو۔" ایک شال اور ہاتھ کی گھڑی انہوں نے اسے پہنا دی۔ اس کے بعد ٹیچرس کی طرف سے ایک دھوتی کرتہ اور پانچ سو روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ پھر لڑکوں کی باری آئی۔

ایک لڑکے نے سب کی طرف سے کچھ کپڑے اور پانچ سو ایک روپے لفافے میں رکھ کر اسے پیش کئے۔

رام راج کو اتنے تحفے اور نقد ملا تھا کہ وہ ریٹائر ہونے کے بعد کئی مہینے تک آرام سے کھا پی سکتا تھا۔

اب وہ حیرت بھری نظروں سے ان تحفوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے جب سب نے دو لفظ بولنے کیلئے کہا تو اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ ہمت کر کے اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ جوڑے اور کہا۔

"ان تحفوں کے لئے آپ سب کا شکریہ..... مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے میرا اسکول چاہئے۔ مجھے یہ بچے چاہئیں۔ اس لئے کہ میرا پریم میری چاہ ان ہی سے ہے۔ آپ یہ نہیں دے سکتے تو....." رام راج کی آواز بھرا گئی لیکن وہ رویا نہیں، بس ایک دم اسٹیج سے اُترا اور تیز تیز قدموں سے ہال سے نکل گیا۔

سونے کا ہے پاکستان

مرتب: عبدالباسط
شاعر: انور شعور

سونے کا ہے پاکستان

انور شعور

اس پر تن من دھن قربان
سب کی جنت سب کا مان
پنجابی، بلوچ، سندھی پٹھان
یک دل یک قلب و یک جان
سونے کا ہے پاکستان
ہم ہیں ایک چمن کے پھول
ایک اساس اور ایک اصول
ایک خدا اور ایک رسول
ایک ہے سب کا دین ایمان
سونے کا ہے پاکستان
ارض خوش رنگ و شاداب
ٹھنڈے پانی کا تالاب
علامہ اقبال ؒ کا خواب
قائد اعظم ؒ کا ارمان
سونے کا ہے پاکستان
شوق شجاعت سے سرشار
ہم سب دو دھاری تلوار
سیسہ پلائی ہوئی دیوار
آندھی آئے یا طوفان
سونے کا ہے پاکستان
سونے کا ہے پاکستان

کوئیز کہانی - ۲

حادثہ

اسامہ بن سلیم

کوئیز کہانی آپ کی معلومات ہی کا نہیں ذہانت کا بھی امتحان ہے، اس مہماتی کہانی کو غور سے پڑھئے اور اس میں موجود دس معلوماتی غلطیوں کی نشاندھی کیجئے۔ نہ صرف نشاندہی بلکہ تصحیح بھی کیجئے۔ اپنے جوابات ایک کاغذ پر لکھ کر ہمیں ۱۰ فروری سے قبل بھجوا دیجئے۔ تمام درست جوابات میں سے تین ساتھیوں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دیا جائے گا جبکہ بقیہ نام ذہانت کے اعتراف کے طور سے شائع بھی کئے جائیں گے۔ معلومات اور ذہانت کے اس انوکھے مقابلے کا انداز آپ کو کیسا لگا۔ ؟ ضرور لکھئے۔

اپنے جواب، بھجواتے ہوئے یہ بات مت بھولئے کہ جواب کے ساتھ اس مقابلے میں شرکت کا کوپن بھی آنا ضروری ہے جو آخری صفحات میں موجود ہے۔ (مرتب)

دانش، ذیشان اور حسن، آج اسکول نہیں گئے تھے، گزشتہ روز اسکول سے واپسی پر اسکول وین کو ایک حادثہ پیش آیا تھا جس میں یہ تینوں زخمی ہوگئے تھے۔ وہ تو شکر ہوا کہ کسی کو کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی اور یہ مصیبت ہلکی پھلکی خراشوں پر ہی ٹل گئی۔ ذیشان کو البتہ کچھ زیادہ چوٹیں آئیں تھیں، اندرونی چوٹوں

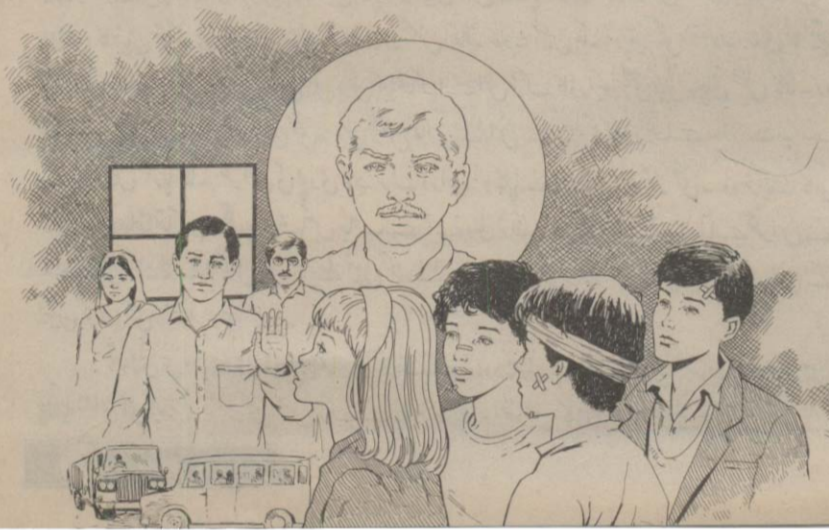

کے درد اور چھوٹے چھوٹے زخموں کی وجہ سے ذیشان کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ ذیشان کمبل اوڑھے اپنے بستر پر پڑا تھا۔ قریب ہی دانش اور حسن بھی لیٹے ہوئے تھے، حادثے کے وقت انعم بھی ان سب کے ساتھ ہی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ بالکل محفوظ رہی۔

انجم صاحب نے بھی دفتر سے چھٹی کر لی تھی، انہوں نے بچوں کا صدقہ اتارا اور بکرے کا گوشت ایدھی سینٹر پہنچا کر آئے۔ امی بچوں کی تکلیف اور ان کے اسکول کی غیر حاضری کی وجہ سے خاصی پریشان تھیں۔ انہوں نے دودھ میں ہلدی اور گھی ملا کر تینوں بچوں کو پلایا۔ ان کی نظر اتاری اور ان کی دلجوئی کے لئے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

دادی اماں بھی تسبیح لئے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آیات کا ورد کر کے بچوں پر پھونک دیتیں۔ کبھی کبھی انہیں اسکول وین والوں پر غصہ آتا تو انہیں برا بھلا کہنے لگتیں۔ "کم بخت ٹھیک طرح سے گاڑی چلاتے ہی نہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس میں بچے سفر کر رہے ہیں..... اور یہ اسکول والے بھی تو انہیں کچھ نہیں کہتے۔" تھوڑی تھوڑی دیر بعد دادی اماں کا سارا غصہ وین والوں پر اترنے لگتا۔

انعم جو اس حادثے میں بالکل محفوظ رہی تھی، تینوں بھائیوں کے قریب ہی بیٹھی ہوئی ان سب کا مذاق اڑا رہی تھی۔ دانش اور حسن کی نوک جھونک بھی جاری تھی، بچوں کی باتوں اور حرکتوں سے کمرے کا منظر کسی مزاحیہ پروگرام کا سا معلوم ہو رہا تھا۔

سب لوگ ہنس بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے مگر ذیشان ان سب سے بے نیاز خاموش لیٹا ہوا کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کا پورا دھیان جس نکتے پر اٹکا ہوا تھا، وہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ذیشان کا خیال تھا کہ جو حادثہ کل پیش آیا تھا، وہ محض اتفاقیہ حادثہ نہیں بلکہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ اس کا شک اس لئے بھی یقین میں بدل گیا تھا کہ اسے اس ٹرک کا ڈرائیور بھی جانی پہچانی شکل کا لگ رہا تھا جس نے ان کی وین کو ٹکر ماری تھی۔ اس شخص کو اس نے اس سے پہلے کہاں دیکھا ہے۔؟ اسے یہ سب کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ مگر اس کی پوری توجہ ٹرک ڈرائیور کو پہچاننے کی طرف مرکوز تھی۔ وہ ٹریفک کا یہ قانون بھی جانتا تھا کہ چورنگی پر ہمیشہ بائیں جانب سے آنے والی ٹریفک کو پہلے گزرنے دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود ٹرک والے نے اسکول وین کو پہلے نہیں گزرنے دیا اور نہ ہی اپنی رفتار کم کی۔ یہ ساری باتیں اس کے یقین کو اور بھی پختہ کر رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ذیشان اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود پھرتی سے اٹھا اور تقریباً انکشاف کے انداز میں چلایا "امی امی ابو..... کل جس ٹرک سے ہمارا حادثہ ہوا تھا اس کا ڈرائیور ڈاکٹر بشیر کا آدمی تھا۔"

کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے ذیشان کے منہ سے نکلی ہوئی اس بات کو سنا مگر کچھ پوچھنے کے بجائے سب کو یوں چپ لگ گئی جیسے کسی کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

"مگر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو.....؟" اضطراب اور تشویش کی کیفیت کے ساتھ انجم صاحب نے پوچھا۔

"ابو میں نے خود اس ڈرائیور کو کئی بار ڈاکٹر بشیر کے گھر پہ آتے جاتے دیکھا ہے۔"

"تو یہ بات تم نے کل ہی کیوں نہ بتائی۔" اس بار ابو کے لہجے میں کچھ کچھ غصہ اور کچھ احتجاج بھی تھا۔

"ابو میں کیا کروں؟ میں تو کل سے ہی یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا ہے، مگر میں کیا کروں مجھے ابھی یاد آیا ہے۔ دانش نے اس تکرار کے دوران اپنے دیدوں کو چاروں طرف گھما کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر فوراً ہی اپنی گردن کو اوپر نیچے ہلا کر ذیشان کی تائید کر دی۔

"ہاں ابو ذیشان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" دانش نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

دانش کے اس بیان کے بعد تو صورتحال بالکل ہی تبدیل ہو گئی۔ گھر کے سب لوگ اس انکشاف پر سہم کر رہ گئے۔

ایسی پریشانی تو انہیں حادثے کی اطلاع ملنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔

گھر کے لوگ اس نئی صورتحال کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ خالد ماموں اور اسلم خالو بھی آ گئے۔ اس انکشاف کا سن کر تو ایک لمحے تو وہ لوگ بھی دم بہ خود رہ گئے۔

خالد ماموں صورتحال کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اس پورے پس منظر سے بھی واقف تھے کہ کس طرح بچوں نے ڈاکٹر بشیر کو گرفتار کروایا تھا۔ اور کس طرح اس کے ضروری کاغذات کی فائیل اٹھائی تھی اور یہ بھی کہ بچوں نے ڈاکٹر بشیر اور ایک مجرم کے درمیان ہونے والی گفتگو کو کس طرح ریکارڈ کر لیا تھا۔

"ڈاکٹر بشیر کا تعلق مجرموں کے کسی بہت بڑے گروہ سے ہے۔" خالد ماموں نے سب تانے بانے ملانے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کوئی معمولی مجرم بچوں کے خلاف اتنی بڑی کاروائی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یقیناً وہ فائیل اور گفتگو بہت اہم ہیں جو بچوں نے حاصل کیں۔ ڈاکٹر اور اس کے گروہ کے لوگ بچوں کو اپنی راہ سے ہٹا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہو سکے گا۔" خالد ماموں نے کہا جو بلا کے ذہین آدمی تھے۔

چلو ابھی ابھی سی آئی اے سینٹر چلیں اور انہیں باخبر کریں۔ اس سے قبل کہ وہ سی آئی اے سینٹر جانے کے لئے روانہ ہوتے خالد ماموں نے چاروں بچوں کو کچھ ہدایات دیں۔

"دیکھو بچو جو بات میں کہہ رہا ہوں، اسے پلو سے باندھ لو۔

نمبر ۱..... کبھی اکیلے گھر سے باہر نہ نکلو۔

نمبر ۲..... دور جانا ہو تو ہمیشہ کسی بڑے کے ساتھ جاؤ۔

نمبر ۳..... جہاں بھی جا رہے ہو اس سے گھر والوں کو باخبر رکھو۔

نمبر ۴..... ہمیشہ سڑک کو اس جگہ سے پار کرو جہاں سڑک پر پار کنگ کا نشان ہو۔

نمبر ۵..... سڑک کو بھاگ کر عبور کرنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔

نمبر ۶..... اجنبی آدمی سے ہمیشہ دور رہو۔

خالد ماموں نے کچھ ضروری ہدایات دیں اور پھر سی آئی اے سینٹر روانہ ہو گئے۔

سی آئی اے سینٹر میں انسپکٹر صدیقی صاحب نے ان سب کی بات پوری توجہ سے سنی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنی کاروائی کا آغاز کرتے انہوں نے کہا کہ "آپ لوگ سب سے پہلے توکل کے حادثے کی آئی ایف آر قریبی پولیس اسٹیشن میں درج کروا دیں۔"

بچوں سے مزید گفتگو کے لئے انسپکٹر صاحب سادہ وردی میں ملبوس کچھ جوانوں کے ساتھ گھر کی طرف چل دیئے۔

انسپکٹر صاحب اس وقت تو واقعی حیران رہ گئے جب بچوں سے گفتگو کے دوران انعم نے اپنی نوٹ بک پر لکھا ہوا ٹرک کا نمبر انہیں پیش کیا۔ انجم نے حادثے کے وقت ہی ٹرک کے نمبر کو ذہن نشین کر لیا تھا اور گھر آتے ہی اسے اپنی نوٹ بک پر اتار لیا تھا۔ LHR 3540 یہ نمبر تو کراچی ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ اسلم خالو نے نمبر پڑھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، اگر یہ نمبر پلیٹ جعلی نہیں تو پھر مجرم ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔" انسپکٹر صاحب نے پُر عزم ہو کر کہا۔

ذیشان کی ذہانت اور انعم کے بروقت نمبر نوٹ کر لینے کی وجہ سے اس الجھے ہوئے کیس کی گتھی بڑی حد تک سلجھ چکی تھی۔

انسپکٹر صدیقی نے بچوں کو ان کی ذہانت کی داد دی اور اپنی تفتیش مکمل کر کے واپس چلے گئے۔

ڈاکٹر بشیر کی گرفتاری اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے انجم صاحب کچھ دل برداشتہ سے ہو گئے تھے انہیں یہ آئے روز کے تھانہ کچہری یا سی آئی اے سینٹر کے چکر لگانا کچھ زیادہ پسند نہیں تھے، نہ ہی

ان کے پاس اتنا وقت تھا، بچوں کے حادثے نے تو انہیں کچھ اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ زرا زرا سی بات پر غصہ کرنا اور چھوٹی چھوٹی بات پر جھڑک دینا ان کے مزاج کا حصہ بنتا جارہا تھا۔ خالد ماموں اس صورت حال کو بھانپ گئے تھے اسی لئے ایک روز انہوں نے انجم صاحب کو خوب لمبا سا لیکچر دے ڈالا۔ اس لیکچر کا ایک فائدہ یہ تو ہوا کہ انجم صاحب بھی اس بات کو سمجھ گئے کہ اگر وہ خود بھی ہمت سے کام نہ لیں گے تو گھر کی خواتین اور بچے تو بالکل ہی بے حوصلہ ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر ایک بار پھر ان کے مزاج کی شگفتگی لوٹ آئی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔

"ابے یار ٹھیک کیا لونڈوں نے، ان الّو کے پٹھوں کو تو گرفتار ہونا ہی چاہئے تھا۔"

انجم صاحب کے اس کھلے ہوئے لب و لہجے سے بچوں کا دل بھی کھل گیا۔ بلکہ انجم صاحب نے یہ کہہ کر سب کو خوشگوار حیرت میں ڈال دیا کہ "اگلے ہفتے سے چاروں بچے کراٹے بھی سیکھیں گے۔ کراٹے کا نام سن کر تو چاروں بچے خوشی سے چلّانے لگے.....ابو زندہ باد.....ابو زندہ باد۔

دانش اور حسن کی تو دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ مشہور افریقی مارشل آرٹ کراٹے۔" دانش، ذیشان اور حسن تینوں ہی کو بے حد پسند تھا۔

دو روز بعد اخبار میں ایک خبر بہت نمایاں شائع ہوئی، "چار ذہین بچوں کی مدد سے اسمگلروں کا بہت بڑا گروہ گرفتار۔" بچوں کے نام اس خبر میں ظاہر نہیں کئے گئے تھے مگر دانش، ذیشان حسن اور انعم یہ بات جانتے تھے کہ یہ کارنامہ انجام دینے والے چاروں بچے ان کے علاوہ کوئی اور نہیں۔" بچوں کے اس کارنامے کی خوشی میں ان کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں قریبی عزیز اور دوست شریک ہوئے۔

فریال اور شیبا نے ننھے سراغرسانوں کو بچوں کے مشہور انگریز شاعر والٹ ڈزنی کا مجموعہ تحفے میں دیا۔

سیما اور ندیم پولینڈ اور کوریا کے درمیان ہونے والی مشہور دوسری جنگ عظیم کی ایک خوبصورت کتاب لے کر آئے۔

ابو نے اسکینڈی نیوین ملکوں یعنی ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور اٹلی کے بارے میں خوبصورت معلوماتی کتابیں انہیں دیں۔

یہ سب تحفے دیکھ کر ان کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

چند ہی روز بعد ان سب کا انٹرویو پاکستان کے مشہور روزنامہ آنکھ مچولی میں بھی شائع ہوا۔

یوں گویا دانش، ذیشان اور حسن کی سراغرسانی کی دھاک سب پر بیٹھ گئی۔

کوئیز کہانی

(۱) فرلاک ہومز نہیں صحیح نام شرلاک ہومز ہے۔ شرلاک ہومز۔ (۲) ونگ کمانڈو ایئر فورس میں ہوتا ہے۔ (۳) صحیح نام کنگ ایڈورڈز کالج لاہور۔ (۴) اردن کا دارالخلافہ بغداد نہیں عمان ہے۔ (۵) فاکس ویگن جاپان نہیں جرمن کار ہے۔ (۶) کیرالہ جنوب مغربی بھارت کا ایک صوبہ ہے۔ (۷) "حامد میاں کے ہاں"۔ ٹی وی کا نہیں ریڈیو کا پروگرام ہے۔ (۸) سی۔ آئی۔ اے کا مطلب کرائم انوسٹی گیشن ایجنسی ہے۔ (۹) افغانی کرنسی افغانی ہی کہلاتی ہے۔ (۱۰) جیمز بونڈ ۰۰۷ صحیح نام ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱) سید واسد حسین شاہ، ضلع ٹھٹھہ، سندھ۔ (۲) نادیہ ثانی، کراچی۔ (۳) مظفرالدین سلطان، ساہیوال۔

درست جوابات دینے والے ساتھیوں کے نام

(۱) اسلمہ انصاری، کراچی۔ (۲) محسن جعفری، کراچی۔ (۳) فضیل مختار صدیقی، دادو۔ (۴) ولید یعقوب، لاہور۔ (۵) تابندہ ریاض، لاہور۔ (۶) محمد احمد، حیدر آباد۔ (۷) ناجیہ لطیف، کراچی۔ (۸) فارینہ صدیقی، حیدر آباد۔ (۹) زہرہ خان، کراچی۔ (۱۰) کرن ظہور، کوئٹہ۔ (۱۱) محمد سلمان خان سنبل، بورے والا۔ (۱۲) فرینہ احتشام، کراچی۔ (۱۳) نادیہ احمد، راولپنڈی۔ (۱۴) عظمیٰ شاہد، فیصل آباد۔ (۱۵) کاشف رضا، کراچی۔ (۱۶) حنا منصوری، حیدر آباد۔ (۱۷) زمیل نثار،

"ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام"

(۱) لبنیٰ سعدیہ، کراچی۔ (۲) نگار دین راشد، کراچی۔ (۳) محمد امین، کراچی۔ (۴) محمد ارشد سلیم، پشاور۔ (۵) اسد اللہ حیدر، اسلام آباد۔ (۶) ریاض احمد سولنگی، کوٹری۔ (۷) کاشف شہزاد، کراچی۔ (۸) خالد عزیز، کراچی۔ (۹) زبیر الحسن، کراچی۔ (۱۰) عدیل احمد خان، کراچی۔ (۱۱) عثمان خلیل، کراچی۔ (۱۲) فرح شہزاد، لاہور۔ (۱۳) رضوان احمد صدیقی، کراچی۔ (۱۴) کامران احمد صدیقی، کراچی۔ (۱۵) صفیہ جالس خان، ایبٹ آباد۔ (۱۶) عدنان محمود صدیقی، حیدر آباد۔ (۱۷) عائشہ، جمیل، لاہور۔ (۱۸) رقیہ منظور، ضلع اٹک۔ (۱۹) عمر جاوید، نوشہرہ کینٹ۔ (۲۰) آمنہ عاصم، کوئٹہ۔ (۲۱) محمد کامران ایوب، کراچی۔ (۲۲) محمد فیصل محسن، کراچی۔ (۲۳) سنبل گل گلزار علی، کراچی۔ (۲۴) عنبرین گلزار علی، کراچی۔ (۲۵) نادیہ شاہین، کراچی۔ (۲۶) ارم فاطمہ، کراچی (۲۷) صفدر سعید صفدر، کراچی۔ (۲۸) راحیل بن عیسیٰ، حیدر آباد۔ (۲۹) طیب شاہ، کراچی۔ (۳۰) عبداللہ شیخ گوہر، حیدر آباد۔ (۳۱) آمنہ طارق، لاہور۔ (۳۲) عباس علی شاہ، کراچی۔ (۳۳) سید نعیم الحق، کراچی۔ (۳۴) ارم اقبال، لاہور۔ (۳۵) محمد شہریار، کراچی۔ (۳۶) سید اظفر علی رضوی، کراچی۔ (۳۷) خالد محمد ناصر، کراچی۔ (۳۸) نوید بخش قادری، اسلام آباد۔ (۳۹) فیصل حمید فاروقی، کراچی۔ (۴۰) عظمیٰ خالد، اسلام آباد۔ (۴۱) محمد خرم قاضی، اسلام آباد۔ (۴۲) فرخ حنیف، رحیم یار خان۔ (۴۳) سعید بخش قادری، اسلام آباد۔

بیرومیٹر

ساجد سعید

ہوا کا دباؤ معلوم کرنے والا آلہ

آپ نے اکثر ٹی وی یا ریڈیو وغیرہ میں موسم کا حال تو سنا ہو گا جس میں موجودہ اور آنے والے موسم کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ بارشیں، تیز ہوائیں، طوفان، برف باری اور گرمی سردی وغیرہ سب موسم کی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ابھی موسم صاف ہے آسمان پر بادل بھی نہیں سورج کی سنہری کرنوں نے اپنی روشنی سے آس پاس کے علاقوں کو روشن کیا ہوا ہے اچانک سیاہ بادلوں کے دیو قامت ٹکڑوں نے سورج کو اپنی آغوش میں لے لیا اور کالی گھٹائیں چھا گئیں اور پھر موسلا دار بارش شروع ہو گئی اسی طرح کی کئی موسمی تبدیلیاں سال بعد میں ہمیں نظر آتی ہیں ان موسموں پر ہوا کا جو دباؤ رہتا ہے اس کا پتا ہمیں ایک چھوٹا سا آلہ بیرومیٹر دیتا ہے جس کو ہم ہوا کا دباؤ ناپنے کا آلہ بھی کہتے ہیں۔

بیرومیٹر دو طرح کے ہوتے ہیں پہلے قسم کا بیرومیٹر ایک لمبی سی شیشے کی ٹیوب پر مشتمل ہوتا ہے جس پر نلی لگی ہوتی ہے اور جس میں پارہ (Mercury) بھرا ہوتا ہے۔ اسے کاٹ کر نچلا حصہ پارہ سے بھری ہوئی نلی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ پیالی کا نیچے کا حصہ ایک پیچ کے ذریعے اوپر نیچے کیا جاتا ہے۔ پیالی پر ایک سوئی ہوتی ہے۔ پیچ کو اس طرح گھمایا جاتا ہے کہ سوئی کا سرا پیالی کے پارے کی سطح کے ساتھ چھو جائے اس طرح باریک پارہ ٹیوب کے اندر ہوا کے دباؤ کے ساتھ ساتھ چڑھتا اور گرتا رہتا ہے اور اس طرح اوپر دیا ہوا (Vernier Scale) ہمیں ہوا کا دباؤ بتا دیتا ہے۔

عام طور پر گھروں میں ایک گھریلوں ساخت کا بیرومیٹر استعمال کیا جاتا ہے جسے (Aneroid Barometer) کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے بکس

پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ ایک دھات کا بنا ہوتا ہے۔ اس کے ڈھکنے لچک دار ہوتے ہیں جو کہ زیادہ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے دب جاتے ہیں اور ہوا کم ہو تو بکس کے اندر کی ہوا اس کے ڈھکنے کو باہر دھکیلتی ہے۔ ڈھکنے کے ساتھ ایک سوئی ہوتی ہے جو ڈائل پر حرکت کرتی ہے۔ ڈائل پر ایک اسکیل ہوتا ہے جیسے آپ تصویر پر دیکھ رہے ہیں جو ہوا کے دباؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ آلہ ۱۹۹۷ء میں ڈبلیو۔ جے کینڈٹ نے ایجاد کیا۔ آپ ریڈیو ٹی وی پر با آسانی موسم کا حال سن سکتے ہیں۔ ہوا کا دباؤ کافی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے تیز ہوائیں، بارشیں، برف اور اولوں کا پڑھنا، طوفان یہ سب موسم ہی کی سوغات ہیں۔ لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ بیرو میٹر ہمیں بالکل صحیح کسی چیز کا پتہ نہیں دے سکتا کہ کیا ہونے والا ہے اور کب۔ ہم اسے صرف (Very Gen-eral Guide) کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

ابھی تو یہیں تھا، کہاں کھو گیا وہ؟

بچے کا خواب

سن سوک چونگ
ترجمہ: منظور الرحمٰن احمد

اس دھرتی کا پتا بتا دو مجھ کو امی جان!
جنگل بیلے دور تلک ہوں پھیلے ہوئے جس کے پاس
جھڑبیری کے بیر جہاں ہوں اور پھولوں کی باس
ٹھہری جھیل کا ساکت پانی جیسے گہرا خواب
جھڑبیری کی پگ ڈنڈی پر جھکتے سرخ گلاب
ان پیڑوں سے ان پھولوں سے
کٹتی جائے ڈھکتی جائے پگ ڈنڈی کی دھار
امن و سکوں کی اس دنیا میں
ہو نہ کوئی سنگی ساتھی
بس..... ہرنوں کی ڈار
اس دھرتی کا پتا بتا دو مجھ کو امی جان!
دور پہاڑی کی ڈھلوانوں سے نیچے میں دیکھوں
چلتا پھرتا دھوپ نگر میں بھیڑ کا گورا بچہ
دور سمندر کی لہروں کی دھیمی سی آواز
ایک اکیلا میں ہوں وہاں پر اور اک اللہ سچا
جہاں پہ بارش آج کے جیسی ہوتی ہو، ہر روز
جہاں فلک پر اڑتے پھرتے رہتے ہوں مرغاب
جہاں ہو جنگل کے مرغوں کی آوازوں کا شور
اڑتے پھرتے پیلے پتے جیسے رنگیں خواب
شہد کی مکھیاں بھن بھن کرتی باغیچے میں گائیں
ہم تم مل کر سارا رستہ سیب ہی چنتے جائیں

یہ حقیقت کچھ

عقیل عباس جعفری

مغالطہ :۔

یورپ کی مشہور صد سالہ جنگ (HUNDRED YEARS WAR) سو سال تک جاری رہی تھی۔

حقیقت :۔

یورپ کی مشہور صد سالہ جنگ جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان لڑی گئی، سو سال نہیں بلکہ تقریباً ۱۱۶ سال جاری رہی تھی۔ اس جنگ کا آغاز ۱۳۳۷ء میں ہوا تھا اور یہ ۱۴۵۳ء میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔

(Ref. Don't You Believe It by Graham and Sylvana Nown, P. 25)

مغالطہ :۔

بیسوی صدی کا آغاز یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے ہوا تھا۔

حقیقت :۔

ایک صدی میں ظاہر ہے سو سال ہوتے ہیں۔ اس لئے انیسویں صدی کا اختتام ۳۱ دسمبر ۱۹۰۰ء کو ہوا تھا اور بیسویں صدی اس کے اگلے دن یعنی یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس لئے یہ خیال کہ بیسویں صدی کا آغاز یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو ہوا تھا، بالکل غلط ہے۔

حوالے :۔

(Ref. Don't You Believe It by Graham & Sylvana Nown, P. 36)

مغالطہ :۔

وہائٹ ہاؤس، سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔

حقیقت :۔

وہائٹ ہاؤس کے نام سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ عمارت شاید سنگ مرمر سے بنائی گئی ہوگی۔ اسی لئے اسے قصر ابیض یا وہائٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہ عمارت بھورے رنگ کے سینڈ اسٹون سے تعمیر کی گئی تھی اور ۱۸۱۴ء تک اس کا رنگ بھورا ہی

تھا۔ ۱۸۱۴ء میں جب انگریزوں نے واشنگٹن پر حملہ کیا تو انہوں نے اس عمارت کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس آتش زدگی سے عمارت کی بیرونی دیواریں تو بدستور کھڑی رہیں مگر اس کا اندرونی حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ عمارت دوبارہ تعمیر گئی اور اس مرتبہ عمارت پر سفید رنگ کر دیا گیا تاکہ آتش زدگی کی تمام علامات مکمل طور پر چھپ جائیں۔ تبھی سے یہ عمارت "وہائٹ ہاؤس" یا قصرِ ابیض کہلانے لگی۔

مغالطہ :۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ شعر میر تقی میر کا ہے۔

حقیقت :۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو یہ شعر میر تقی میر کا ہے نہ ہی اس کے مصرعِ اولیٰ میں میر کا تخلص استعمال ہوا ہے۔

یہ شعر دراصل اس طرح ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مشہور محقق پروفیسر عطاالرحمٰن عطا کاکوی اپنے مضمون "میر کے مفروضہ اشعار" میں لکھتے ہیں۔

"اس شعر میں تخلص امیر ذرا تکلف سے آیا ہے اور خواہ مخواہ زبان سے بے ساختہ میر نکل پڑتا ہے۔ اسی لئے اکثر لوگ اس شعر کو میر سے منسوب کر دیتے ہیں۔ خواجہ فاروقی صاحب بھی میر ہی کا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ شعر ایک شاعر امیر کے شاگرد قائم کا ہے۔ اور تذکرہ شوق میں اسی کے نام سے منسوب ہے۔"

دوسری طرف ایک اور محقق جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون "جگر لخت لخت" میں لکھتے ہیں۔

"یہ شعر اصل میں امیر مینائی کا ہے۔ جس کا پہلا مصرعہ غالباً یوں ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے امیر ولے"

ان دونوں محققین کی تحقیق کے مطابق ایک بات ثابت ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ شعر کسی امیر تخلص والے شاعر کا ہے میر تقی میر کا ہرگز نہیں ہے۔

حوالے :۔

۱۔ تحقیقی مطالعے از عطاالرحمٰن عطا کاکوی
۲۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مغالطہ :۔

تمام پرندے گھونسلہ بنا کر رہتے ہیں۔

حقیقت :۔

عام طور پر پرندوں اور گھونسلوں کا ساتھ چولی دامن کا سمجھا جاتا ہے۔ مگر سب پرندے گھونسلے نہیں بناتے۔

کئی پرندے، جن میں الّو اور طوطے شامل ہیں، گھونسلے میں رہنے کے بجائے درختوں کے تنوں میں بنے ہوئے سوراخوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ ریت میں اور گھاس پھونس میں ہی قیام فرماتے

ہیں۔ اور کچھ پرندے، جن میں کوئل کا نام سرفہرست ہے، کبھی گھونسلہ نہیں بناتے وہ نہ صرف دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتے ہیں بلکہ اس گھونسلے کے اصل مالک کو وہ انڈا سینے کی اجازت بھی دے دیتے ہیں۔

اسی طرح کنگ پینگوئن بھی گھونسلے کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب وہ انڈا دیتا ہے تو اپنا انڈا اپنے پاؤں کے نیچے دبالیتا ہے اور اس کے پاؤں کی جلد پر چڑھی ہوئی تہہ اس انڈے کی بخوبی حفاظت کرتی ہے۔

Ref. 1. Bananas Don't Grow on Trees by Joseph Rosenbloom, P. 46

2. Don't You Believe It by Gyles Brandreth, P. 114

3. Facts and Fallacies by Rhoda and Leda Blumberg, P. 26

مغالطہ :۔
شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔
حقیقت :۔

جن ممالک یا جن علاقوں میں شیر پایا جاتا ہے، ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شیر گھنے جنگل میں رہنے کے بجائے سرسبز میدانوں یا کھلی جھاڑیوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے، سراسر غلط ہے۔ کیونکہ وہ جنگل میں رہتا ہی نہیں ہے۔
مغالطہ :۔

انسان دنیا کا واحد حیوان ہے جو اوزار بناتا ہے۔
حقیقت :۔

انسان کے علاوہ کئی حیوان ایسے ہیں جو اپنے استعمال کے لئے قدرتی اشیاء کو نہ صرف بطور اوزار استعمال کرتے ہیں بلکہ خود بھی اوزار بناتے ہیں۔ ان حیوانوں میں سب سے نمایاں نام چمپینزی کا ہے۔

چمپینزی کا تعلق بندر کی نسل سے ہوتا ہے۔ وہ دیمک بہت شوق سے کھاتا ہے اور انہیں ان کے سوراخوں سے نکالنے کے لئے درخت کی چھال بطور اوزار استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ چوسنے والی پتیوں کو بطور اسفنج استعمال کرکے درختوں کے سوراخوں سے پانی جذب کرکے پیتا ہے کیونکہ ان سوراخوں میں اس کا منہ داخل نہیں ہوسکتا۔

کچھ بندر بیجوں اور پھلوں کو اٹھانے کے لئے پتے اور اخروٹ اور مونگ پھلی توڑنے کیلئے ہڈیوں کو استعمال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ پرندے بھی اپنے استعمال کے لئے اوزار بنانے پر قادر ہوتے ہیں۔ مثلاً مشہور پرندہ WOOD PEACKER جسے اردو میں کٹھ بڑھئی کہتے ہیں، کیکٹس کی لکڑی کے ذریعے درختوں کی چھال میں چھپے ہوئے کیڑے مکوڑے تلاش کرلیتا ہے۔

حوالے :۔

(Ref. Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg. P. 9)

کرکٹ ورلڈ کپ 92ء

اندازے اور اندیشے

راشد عزیز

اگر کرکٹ میچ کے دوران بارش ہو جائے تو تماشائی بہت بے مزا ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کسی موسم میں کوئی کرکٹ سیریز ہو کسی نہ کسی میچ کے دوران بارش ہو جاتی ہے۔ بارش کا نقصان ان لوگوں کو خاص طور پر ہوتا ہے جنہوں نے پانچوں دنوں کے ٹکٹ ایڈوانس میں خریدے ہوتے ہیں۔ انہیں مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں بارش نے ہزاروں میچ برباد کئے ہیں وہیں اس کا کرکٹ پر بہت بڑا احسان بھی ہے۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان میلبورن میں پانچ روزہ ٹیسٹ کے ابتدائی چار دن بارش کے سبب ضائع ہوگئے تو منتظمین نے تماشائیوں کو مایوسی سے بچانے کے لئے آخری دن محدود اوورز کے ایک میچ کا اہتمام کیا اور یوں ایک روزہ کرکٹ کی بنیاد پڑ گئی۔ جو آج کرکٹ کی مقبول ترین شکل ہے۔

کرکٹ اگرچہ دنیا کے چند ممالک میں کھیلی جاتی ہے۔ صرف ان ممالک میں جو انگریزوں کے زیر تسلط رہے ہیں۔ لیکن جن بھی ممالک میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ وہاں کا یہ مقبول ترین کھیل ہے۔ مثلاً ویسٹ انڈیز، بھارت، پاکستان، سری لنکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور انگلستان وغیرہ۔ ویسٹ انڈیز میں تو اس کھیل کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں اگر کسی بچے سے پوچھا جائے کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے تو وہ ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ بننے کے بجائے کہتا ہے کہ میں بڑا ہو کر

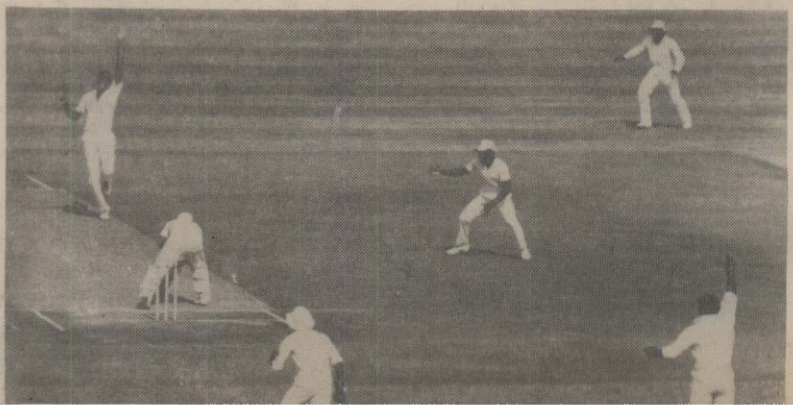

کرکٹر بنوں گا۔ لیکن اس قدر مقبولیت کے باوجود کرکٹ کے کھیل پر مختلف حلقوں کی جانب سے تنقید شروع ہوگئی تھی۔ خود کرکٹ کے شائقین کو بھی یہ بات محسوس ہونے لگی تھی کہ کرکٹ کا یہ ست کھیل اس جدید مشینی دور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ خاص طور پر اس کا یہ پہلو کہ پانچ روز کے کھیل کے بعد بھی کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو، تکلیف دہ محسوس ہونے لگا تھا۔ جب ایک روزہ محدود اوورز کے میچوں کا آغاز ہوا تو لوگوں کو کرکٹ کی یہ شکل بڑی پسند آئی۔ صرف ایک روز کا کھیل اور اس میں بھی ہار جیت کا فیصلہ لازمی۔

کرکٹ کے ہیڈ کوارٹر لارڈز لندن میں اس کھیل کی مقبولیت کو برقرار رکھنے بلکہ اس کو مزید مقبول بنانے کے لئے فٹ بال کے عالمی کپ کی طرز پر کرکٹ کے عالمی کپ کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ دنیا میں سب سے زیادہ کرکٹ انگلستان میں کھیلی جاتی ہے اور کرکٹ کے سب سے زیادہ میدان بھی انگلستان ہی میں ہیں لہٰذا کرکٹ کا پہلا عالمی کپ ۷۵-۱۹۷۴ء میں انگلستان ہی میں ہوا۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی ٹیمیں بڑے فارم میں تھیں لیکن ماہرین نے پاکستانی ٹیم کو ٹورنامنٹ کا فیورٹ ٹیم قرار دیا تھا لیکن غیر متوقع طور پر پاکستان کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں رہی اور ویسٹ انڈیز نے پہلا عالمی کپ جو انگلستان کی پرڈونشل انشورنس کمپنی نے انسپانسر کیا تھا جیت لیا۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستانی ٹیم کے کپتان آصف اقبال بنائے گئے تھے لیکن وہ بیماری کے سبب نہ کھیل سکے اور ماجد خان نے ٹیم کی قیادت کی۔

دوسرا عالمی کپ بھی انگلستان ہی میں ہوا اور ایک بار پھر ویسٹ انڈیز نے اپنا اعزاز برقرار رکھا لیکن تیسرا عالمی کپ جس کا انعقاد ۱۹۸۳ء میں انگلستان میں ہوا بڑا سنسنی خیز رہا۔ اس ٹورنامنٹ کی فیورٹ ٹیمیں

ویسٹ انڈیز، پاکستان اور انگلستان کی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر بھارت نے فائنل میں ویسٹ انڈیز کو شکست دے کر یہ ٹورنامنٹ جیتا یہ نتیجہ خود بھارت کے کھلاڑیوں کے لئے غیر متوقع تھا۔ بہرحال کرکٹ کا کھیل تو کہلاتا ہی غیر متوقع نتائج کا کھیل۔

چوتھے عالمی کپ سے قبل پاکستانی کرکٹ بورڈ کے سابق چیئرمین ایئر مارشل ریٹائرڈ نور خان نے یہ

سوال اٹھایا کہ کیا عالمی کپ کرانے کا حق صرف انگلستان ہی کو ہے کوئی دوسرا ملک اس کی میزبانی کیوں نہیں کر سکتا؟ لہٰذا انہوں نے بھارت کے ساتھ مشترکہ طور پر چوتھے عالمی کپ کی میزبانی کی پیشکش کر دی اور یہ پیشکش قبول بھی کر لی گئی اور چوتھا عالمی کپ پاکستان اور بھارت میں کھیلا گیا۔ بھارتی ٹیم تیسرے عالمی کپ کی فاتح تھی اور چونکہ عمران خان کی زیر قیادت پاکستانی ٹیم اس وقت انگلستان، بھارت، آسٹریلیا اور ویسٹ کی ٹیموں کو شکست دے چکی تھی لہٰذا اس ٹورنامنٹ کے لئے پاکستان کو نمبر ایک فیورٹ اور بھارتی ٹیم کو نمبر دو فیورٹ قرار دیا گیا لیکن اس ٹورنامنٹ کا نتیجہ بھی تیسرے عالمی کپ جیسا رہا اور یہ ٹورنامنٹ آسٹریلوی ٹیم جیت گئی جس کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

پانچواں عالمی کپ ۲۲ فروری سے آسٹریلیا میں شروع ہو رہا ہے جس کی نمایاں ٹیموں میں میزبان ٹیم کے علاوہ پاکستان، ویسٹ انڈیز، بھارت اور نیوزی لینڈ کی ٹیمیں شامل ہیں۔ اس ٹورنامنٹ میں پہلی بار جنوبی افریقہ کی ٹیم بھی حصہ لے رہی ہے۔ چونکہ یہ ٹورنامنٹ آسٹریلیا میں کھیلا جارہا ہے لہٰذا ہر لحاظ سے اس ٹورنامنٹ کی فیورٹ ٹیم آسٹریلیا ہی کو قرار دیا جارہا ہے۔ گزشتہ دو تین برسوں میں آسٹریلیا کی ٹیم بیٹنگ اور بولنگ دونوں شعبوں میں بڑی مضبوط ٹیم بن کر ابھری ہے۔ پھر آسٹریلیا کی فاسٹ وکٹوں پر سب سے زیادہ بہتر طور پر میزبان ٹیم ہی کھیل سکتی ہے۔ ٹورنامنٹ کی دوسری فیورٹ ٹیم ویسٹ انڈیز کی ہو سکتی ہے۔ جس کے پاس بہترین فاسٹ بولرز بھی ہیں اور ان کے بیٹسمین فاسٹ وکٹوں پر باآسانی کھیل بھی لیتے ہیں لیکن گزشتہ برسوں میں ویسٹ کی ٹیم کی کارکردگی میں کوئی تسلسل نہیں رہا ہے۔ وہ جتنی آسانی سے کوئی میچ جیت لیتی

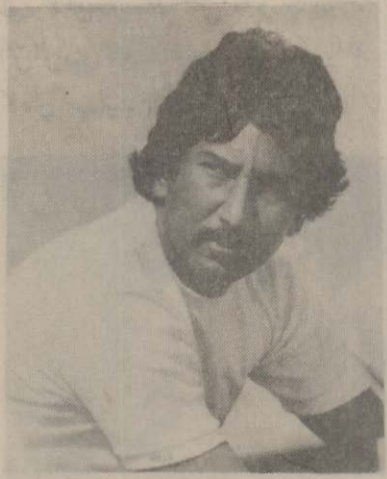

ہے۔ اتنی آسانی سے ہار بھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس ٹیم کے بارے میں کوئی پیش گوئی بڑی مشکل ہے۔ بھارت کی ٹیم بیٹنگ کے شعبہ میں بڑی مضبوط ٹیم ہے۔ لیکن ان کی بولنگ معیاری نہیں ہے۔ لیکن بھارتی ٹیم کے لئے ایک فائدہ مند بات یہ ہے کہ وہ گزشتہ دو ماہ سے آسٹریلیا کے دورے پر ہے اور وہاں کی وکٹوں پر ضروری پریکٹس حاصل کر رہی ہے جس کا فائدہ آخر کار اسے ہوگا۔

پاکستانی ٹیم اس وقت بھی دنیا کی کسی بھی ٹیم کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستانی فاسٹ بولرز وقار یونس، وسیم اکرم اور عاقب جاوید وغیرہ کا شمار دنیا کے بہترین فاسٹ بولرز میں ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستانی بیٹسمین آسٹریلوی وکٹوں پر کس طرح کھیلتے ہیں۔ جاوید میانداد دوبارہ فارم میں آچکے ہیں اگر سلیم ملک، عمران خان، زاہد فضل، رمیز راجہ اور انضمام الحق بھی وہاں چل گئے تو بہت ممکن ہے کہ پاکستان کا عالمی کپ جیتنے کا خواب پورا ہو جائے لیکن اس موقع پر بہت اچھا ہوتا کہ بھارت کی طرح پاکستانی ٹیم بھی آسٹریلیا کا دورہ کرتی اور عالمی کپ سے قبل وہاں کے موسم اور وکٹوں کا تجربہ حاصل کرتی۔

اس ٹورنامنٹ کے لئے انگلستان کی ٹیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اگرچہ ماضی میں اس ٹیم کی کارکردگی کوئی خاص نہیں رہی ہے لیکن انگلستان کے کرکٹر صحیح معنوں میں پروفیشنل کرکٹر ہیں اور ان سے کوئی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔

خوشی کا یہ لمحہ کاش ورلڈ کپ میں بھی میسّر آجائے۔

مولا دلائے تو مل جائے

نوشینہ سحر

اودھ کے نواب سراج الدولہ بہت سخی اور رحم دل اور دریا دل آدمی تھے ان کے دروازے سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ مسافروں کے لئے بھی ہر وقت لنگر جاری رہتا تھا۔ سب کھاتے اور نواب صاحب کو دعائیں دیتے۔ ان دنوں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں فقیر یہ صدا لگا کر خیرات مانگا کرتے تھے "مولا دلائے تو مل جائے"۔ ان میں سے ایک فقیر نے ایک دن سوچا اللہ کے نام پر مانگنے سے جو تھوڑا بہت ملتا ہے اس سے تو بس روز کی روٹی ہی پوری ہوتی ہے کوئی ایسی صدا ایجاد کرنی چاہئے جس سے نواب صاحب خوش ہو جائیں اور اتنی خیرات مل جائے کہ تمام مسئلے حل ہو جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی اور اس نے ایک دن نواب صاحب کے محل کے نیچے پہنچ کر یہ صدا لگائی "جس کو نہ دے مولا اس کو دے سراج الدولہ۔" نواب صاحب کے کان میں یہ صدا پہنچی تو اپنی خوشامد بھری تعریف سن کر بہت خوش ہوئے اور اس فقیر کو اپنے پاس بلایا اور ایک نہایت عمدہ خربوزہ دے کر کہا "تو میرا نام لے کر

خیرات مانگتا ہے لے آج میری طرف سے یہ خربوزہ کھا۔ " فقیر نے وہ خوشبو دار عمدہ خربوزہ لے لیا اور نواب صاحب کو دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔ جب وہ محل کی ڈیوڑھی سے باہر نکلا تو اس نے سوچا کہ صبح سے اب تک تمباکو نہیں ملا۔ سارا جسم ٹوٹ رہا ہے جمائیاں آرہی ہیں کسی سے اس خربوزہ کے بدلے تمباکو حاصل کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ ایک تمباکو بیچنے والے کی دکان پر پہنچا۔ دکان کا مالک تو اس وقت دکان پر موجود نہیں تھا لیکن اس کا کم عمر بیٹا دکان پر بیٹھا تھا فقیر نے اس سے کہا "لڑکے خربوزہ کھائے گا؟ دیکھ کیسا عمدہ خربوزہ ہے یہ خربوزہ تو کھالے اور مجھے اس کے بدلے تھوڑا سا تمباکو دے دے۔ " لڑکے نے خربوزہ اس سے لے کر تمباکو دے دیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکے کا باپ دکان پر آیا گیا خربوزہ دیکھ کر اس نے بیٹے سے پوچھا " یہ خربوزہ کہاں سے آیا؟" لڑکے نے جواب دیا "ایک فقیر آیا تھا وہ تھوڑا سا تمباکو لے گیا اور اس کے بدلے یہ خربوزہ مجھے دے گیا۔" باپ نے بیٹے سے کہا "تمہیں فقیر سے خربوزہ نہیں لینا چاہئے تھا اسے کسی فقیر ہی کو دے دینا۔ " ابھی وہ یہ بات کر رہا تھا کہ صدا سنائی دی " مولا دلائے تو مل جائے " لڑکے نے یہ خربوزہ فقیر کو دے دیا۔ فقیر خربوزہ لے کر دعائیں دیتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ اپنی جھونپڑی میں جا کر فقیر نے یہ خربوزہ کاٹا تو اس میں سے ایک قیمتی لعل نکلا۔ یہ لعل دراصل نواب صاحب نے بہت ہوشیاری سے خربوزہ میں اس طرح رکھ دیا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ فقیر نے جونہی لعل دیکھا تو وہ اللہ کی عنایت پر اس کا شکر بجالایا اس نے سوچا کہ لعل کو بازار میں بیچ دوں گا۔ پھر چھوٹی موٹی دکان کر کے عزت سے روزی کماؤں گا اور بھیک مانگنا چھوڑ دوں گا۔ ادھر وہ فقیر جب تمباکو پی چکا تو بہت سخت بھوک لگی اور خربوزہ یاد آیا مگر " اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت " بھوکا ہی اپنی کٹیا میں جا پڑا۔ دوسرے دن پھر وہ نواب صاحب کے محل کے نیچے گیا اور صدا لگائی " جس کو نہ دے مولا اس کو دے سراج الدولہ۔ " نواب صاحب نے فقیر کی صدا سنی تو بہت حیران ہوئے اور دل میں کہنے لگے کہ کل ہی تو ہم نے ایک بیش قیمت لعل خربوزے میں رکھ کر دیا تھا آج پھر بھیک مانگنے نکل آیا۔ انہوں نے فقیر کو اپنے سامنے بلوایا اور پوچھا۔ "کل جو خربوزہ ہم نے تجھے دیا تھا تو نے وہ کھایا تھا۔ " فقیر نے کہا جی نہیں سرکار۔ نواب نے پوچھا اس خربوزے کا تو نے کیا کیا؟ حضور اس کے بدلے میں نے تمباکو پی لیا تھا۔ فقیر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا یہ سن کر نواب صاحب نے اس تمباکو والے کو بلوایا اور اس سے پوچھا۔ کل اس فقیر نے تمہیں کوئی خربوزہ دیا تھا۔ تمباکو فروش نے جواب دیا۔ حضور معاف فرمائیں میرے لڑکے نے غلطی سے وہ خربوزہ اس فقیر سے لے لیا تھا۔ میں نے یہ خربوزہ ایک اور فقیر کو دے دیا تھا۔ نواب صاحب نے پوچھا کون سے فقیر کو۔ تمباکو فروش نے کہا جو مولا دلائے تو مل جائے کی صدا لگا کر بھیک مانگتا ہے اور فلاں جھونپڑی میں رہتا ہے۔ نواب صاحب نے خادموں کو بھیج کر اس فقیر کو تلاش کرایا جب وہ آگیا تو اس سے دریافت کیا۔ کل

اس تمباکو والے نے تجھے کوئی خربوزہ دیا تھا۔ فقیر نے کہا دیا تو تھا۔ نواب صاحب نے پوچھا اس خربوزہ کے اندر سے تجھے کچھ ملا۔ فقیر نے مولا دلائے تو مل جائے کی صدا لگائی اور کہا۔ ہاں۔ حضور ایک قیمتی لعل ہاتھ آیا تھا۔ مولا دلائے تو مل جائے۔ اب نواب صاحب نے دل میں سوچا کہ یہ فقیر بار بار یہی کہتا ہے۔ مولا دلائے تو مل جائے میرا نام نہیں لیتا۔ لعل تو میں نے خربوزہ میں رکھا تھا۔ لیکن اب تک نواب صاحب کو اصل بات معلوم ہو چکی تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ واقعی آدمی آدمی کو کیا دے سکتا ہے۔ دینے والا تو ایک ہی ہے جس کے در کا ہر شخص گدا ہے یقیناً اسی کو ملتا ہے جسے اللہ دلاتا ہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تکبر کی معافی مانگی اور اس فقیر کو مزید انعام و اکرام دے کر رخصت کیا اب نواب صاحب دوسرے فقیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے نصیحت کی کہ آئندہ سے میرا نام لے کر خیرات نہ مانگنا۔ نام اسی کا لینا جو حقیقت میں سب کو دیتا ہے اور اسے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا۔

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

Midas

نائی کی حجامت

عنبر چغتائی

کوئی حجام کی دوکاں پہ آیا
اور اک بچے کو اپنے ساتھ لایا
کہا "جلدی سے میرا شیو کر دو"
پھر اس بچے کے سر سے بال کاٹو
یقیں ہے دس منٹ سے پہلے لوٹوں
میں کیفے ٹیریا میں چائے پی لوں
وہاں اک دوست میرا منتظر ہے
بلایا چائے پر آج اُس نے پھر ہے
وہ فوراً چل دیا داڑھی منڈا کر
اسی کرسی پہ لڑکے کو بٹھا کر
وہ جب کچھ دیر تک واپس نہ آیا
دیا نائی نے بچے کو دلاسہ
"نہ رونا، ابا جان آتے ہی ہوں گے
کہ جانا ہے مکان، آتے ہی ہوں گے
یہ سن کر اس نے جیبوں کو ٹٹولا
چنے اور کشمشیں کچھ کھا کے بولا
ہم ان کے واسطے رونے لگے کیوں
ہمارے باپ وہ ہونے لگے کیوں

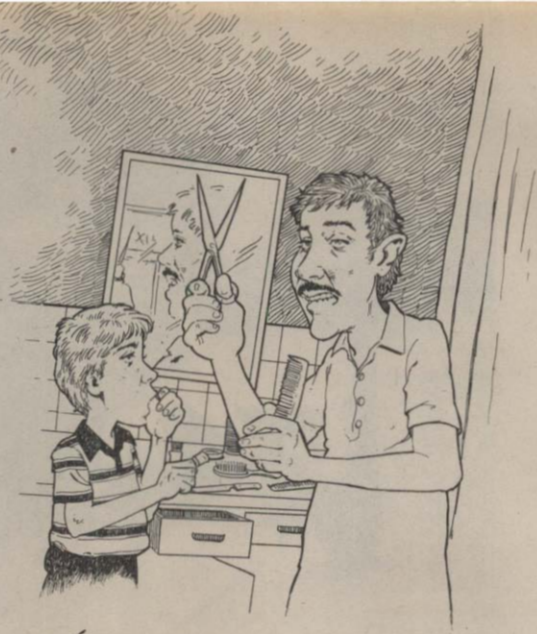

تمہارے بھائی یا بہنوئی ہیں پھر؟
کہا حجام نے ہیں کون آخر؟
نہیں رشتہ تو وہ لاتے تمہیں کیوں
چچا ہوں گے، نہیں تو ہوں گے ماموں
وہ بولا ہم گلی میں کھیلتے تھے
بلا کر وہ ہمیں لائے یہ کہہ کے
تمہارے بال کتنے بڑھ گئے ہیں
یہ کالر ہیں نا! اس پر چڑھ گئے ہیں
کٹنگ اچھی کرا دوں گا تمہاری
خلیفہ ہیں مرے بچپن کے ساتھی
یہ سارے بے تکے چھٹ جائیں گے بال
یہاں پر مفت میں کٹ جائیں گے بال

عمر تو میری بھی ایک سال ہے لیکن صحت ذرا ......

آنکھ مچولی البم

تیری میری ایسی دوستی

انتخاب ...... کاشف عزیز، کراچی

ایک شخص اپنے دوست سے تعزیت کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے دادا جان کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا کیا عمر تھی مرحوم کی؟"

"اٹھانوے سال۔" جواب ملا۔

"اوہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ دو سال اور جی لیتے تو سنچری ہو جاتی۔"

...... O ......

دروازے پر دیر سے دستک ہو رہی تھی۔ تیز بارش کی وجہ سے وہ اٹھنے میں سستی کر رہا تھا۔ بالآخر چھتری سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے پر ڈاکیا کھڑا تھا۔ اس نے خط لیا اور بولا۔ "بھلے آدمی اس بارش میں کیوں زحمت کی، پوسٹ کر دیا ہوتا۔"

ایک کنجوس شخص چھت پر سے گر پڑا، جب اسے اسپتال لے جانے لگے تو چلا کر بولا۔

"بیگم! ناشتے میں آملیٹ مت بنانا اور ہاں دوپہر کا کھانا بھی مت بنانا کیونکہ وہ اسپتال سے ملے گا۔"

...... O ......

"ہر بچے کا فرض ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنی ذات سے خوش کرے۔" مس نے بچوں کو سمجھایا پھر سوال کیا۔ "ذیشان! اس ہفتے آپ نے کسے خوش کیا۔" ذیشان نے بتایا۔ "میں جمعہ کو اپنی خالہ کے گھر گیا تھا، شام کو گھر آنے لگا تو خالہ نے کہا۔ "شکر ہے شام ہو گئی، تم اندازہ نہیں لگا سکتے

تمہارے جانے سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

○

ایک بڑے پولیس آفیسر سے ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کے ایک سپاہی نے اس کی گھڑی اور بٹوہ چھین لیا ہے۔ پولیس افسر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پوچھا۔ "تم اس وقت یہی سوٹ پہنے ہوئے تھے؟"

"جی جناب!" اس نے جواب دیا۔

"تو بھاگ جاؤ یہاں سے۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔" آفیسر نے اسے دھتکارا۔ "اگر میرا سپاہی ہوتا تو یہ سوٹ تمہارے جسم پر نہ رہتا۔"

پولیس والا..... مجھے ایک اشتہاری مجرم کی تلاش ہے جس کی صرف ایک ٹانگ ہے جس کا نام شرفو ہے۔

مخبر..... اور دوسری ٹانگ کا کیا نام ہے؟

○

استاد (شاگرد سے) آملیٹ کو جملے میں استعمال کرو؟

شاگرد..... اس سال آم لیٹ ہیں۔

○

ایک صاحب ۵ منزلہ عمارت سے اتر کر دفتر جا رہے تھے۔ راستے میں انہیں یاد آیا کہ عینک گھر بھول آئے ہیں۔ لہٰذا پلٹ کر نیچے سے اہلیہ کو آواز دی۔ آواز سن کر بیگم اوپر آئیں اور پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بھئی! میں عینک بھول آیا ہوں۔"

بیگم! "کیا کہا، آواز نہیں آ رہی ہے۔"

صاحب کو یاد آیا کہ ان کے گلے میں دوربین لٹک رہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ بیگم کے چہرے کو فوکس کیا اور دھیرے سے کہا۔

"بیگم! میں عینک بھول آیا ہوں۔ اوپر سے لا دیجئے۔"

ایک عورت ..... تم اپنے شوہر کا دماغی علاج کروا رہی ہو۔ کیا انہیں افاقہ ہوا؟"

دوسری عورت ..... ارے کل میں انہیں اسپتال لے گئی تھی جب ہم رکشے سے اترے تو میرے شوہر نے مجھے روپے پکڑائے اور ڈرائیور کو گھسیٹتے ہوئے اسپتال لے گئے۔

..... ○ .....

میں نے ایک بار ایک رسالے کو خط لکھا جس میں تحریر کیا کہ اکثر باتیں خطوط میں لکھی نہیں جا سکتیں کیونکہ سنسر آفس خط کھول لیتا ہے۔ اس خط کو پوسٹ کرنے کے ایک ہفتے بعد سنسر آفس سے مجھے ایک خط ملا جس میں تحریر تھا۔ "ہم خط نہیں کھولتے۔ یہ الزام ہے"

..... ○ .....

خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر کی شادی تھی۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ دولہا بنا کار میں جا رہا تھا پیچھے باراتیوں کی بس تھی۔ اچانک انسپکٹر نے سر اٹھا کر اپنے دوست سے کہا۔ "عامر! ایک بس مسلسل ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ دفتر وائرلیس کرو۔"

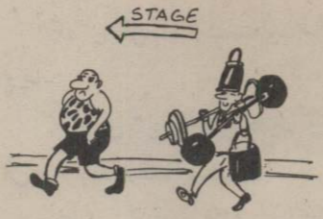

دو عقاب فضا میں بہت اونچے اڑ رہے تھے کہ ایک جیٹ طیارہ ان کے قریب سے شعلے اور دھواں چھوڑتا ہو گزر گیا۔ "بڑا عجیب سا پرندہ تھا۔" ایک عقاب بولا۔ "مگر یہ اس قدر تیزی سے کیوں جا رہا تھا؟"

"عجیب احمق ہو تم" دوسرا بولا۔ "اگر تمہاری دُم جل رہی ہو تو تم تیزی سے نہیں اڑو گے؟"

..... ○ .....

والد صاحب (بیٹے کا رزلٹ دیکھتے ہوئے) تم تو تمام مضمون میں فیل ہو گئے ہو۔ کسی مضمون میں پانچ یا چھ نمبر سے زیادہ نہیں لئے۔

بیٹا۔ "اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ میں نقل نہیں کرتا۔"

انشورنس کمپنی کے ایجنٹ سے ایک صاحب نے پوچھا۔

"اگر آج میں اپنی بیوی کا بیمہ کراؤں اور کل وہ مر جائے تو مجھے کیا ملے گا!"

"پھانسی یا عمر قید۔" ایجنٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔

ایک آدمی نے سڑک پر دیکھا کہ ایک پتھر پر لکھا ہے کہ "جس نے قسمت آزمانی ہو وہ یہ پتھر اٹھائے۔"

اس شخص نے پتھر اٹھایا تو نیچے لکھا تھا۔ "پتھر واپس رکھ دیں۔ آپ جیسے اور بے وقوف بھی آتے ہوں گے۔"

برما کے محاذ پر رائل انجینئرنگ کور کے کمانڈنگ افسر نے اپنے ایک لیفٹیننٹ کو دلدلی علاقے میں سڑک تعمیر کرنے کو کہا۔ اس نے موقع کا معائنہ کیا اور کہا "یہاں سڑک کی تعمیر ناممکن ہے کیونکہ دلدل آدمی کے قد سے بھی گہری ہے۔"

کرنل نے گرج کر کہا "بکو مت! سڑک تمہیں تعمیر کرنی ہوگی جو چیز درکار ہے لکھ کر دے دو، وہ تمہیں مہیا کر دی جائے گی۔"

لیفٹیننٹ سیلوٹ کر کے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کرنل کو چٹ دی گئی جس پر لکھا تھا، "سڑک کی تعمیر کے لئے سولہ سولہ فٹ کے دس آدمی مہیا کئے جائیں تاکہ تعمیر جلد شروع ہو سکے۔"

ایک شخص اپنے کنجوس دوست کو نصیحت کر رہا تھا۔ "یہ دولت کس کام آئے گی؟ چار آدمیوں میں طعنے کے لئے تمہارے کپڑے قیمتی اور صاف ستھرے ہونے چاہئیں۔ اپنے والد اور دادا کو یاد کرو۔ کس ٹھاٹھ کا لباس پہنتے تھے۔"

کنجوس نے فقرہ مکمل ہونے سے پہلے تڑپ کر کہا "پھر مجھے کیوں طعنے دیتے ہو۔ میں نے وہی کپڑے تو پہن رکھے ہیں۔"

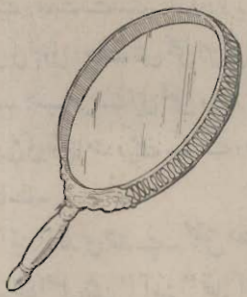

چیزوں کی کہانی

آئینہ

آصف فرخی

چیزوں کی کہانی میں سب سے عجیب کہانی اس چیز کی ہے۔ جس کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی اس چیز کو نہیں دیکھتا بلکہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ یہ آئینہ ہے کہ جو اس کے سامنے آتا ہے وہ سب کے سامنے کر دیتا ہے۔ خود نہ کچھ کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اس میں جھانکنے والا جو کہے یا کرے، اسی کو دہرا دیتا ہے۔ آئینہ بلا کا سچا ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا، کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جو اس کو دیکھتا ہے، منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ سے جو پہیلیاں اور دوسخنے منسوب ہیں، اس میں سے ایک یوں ہے۔

فارسی بولی آئینہ
ترکی بولی پائی نہ
ہندی بولی آر سی آئے
منہ دیکھے جو اسے بتائے

اس کا جواب ہے، آئینہ۔ جس نے اسے بوجھ لیا اس نے آئینہ دیکھا اور آئینہ کیا دیکھا، اپنا منہ دیکھ لیا۔ مگر آئینے صرف منہ دیکھنے کے لئے نہیں ہوتے، ان کے اور بھی بہت سے استعمال ہیں، اور آئینے کی کہانی صدیوں پرانی ہے۔

آج تو ہم سب آئینے سے واقف ہیں، مگر جب ابتدائی دور کے انسان کا پہلی بار آئینے سے تصادم ہوا ہوگا تو اسے بہت عجیب لگا ہوگا۔ شاید وہ سمجھا ہو کہ کوئی اس کا منہ چڑا رہا ہے۔ اسے بھلا یہ کون بتاتا کہ آئینے میں اس کا عکس ہے، کوئی اس کی نقل نہیں کر رہا۔

انسان کے لئے پہلا آئینہ، ٹھہرا ہوا پانی رہا ہوگا۔ جنگل میں چلتے چلتے وہ پیاس بجھانے کے لئے پانی پر جھکا ہوگا۔ پانی کی سطح پر ایک چہرہ تیرتا ہوا دیکھ کر ٹھٹھک گیا ہوگا۔ اس اجنبی کو اپنے پانی سے بھگانے کے لئے شاید اس نے کنکری ماری ہوگی۔ کنکری مارنے سے پانی پر ارتعاش ہوا ہوگا اور وہ چہرہ بھنور لہروں کے ساتھ دور تک بہتا چلا گیا ہوگا۔ وہ اس چہرے کو دیکھ کر ڈر گیا ہوگا، اور اسے جادو کا اثر سمجھا ہوگا۔

پانی میں عکس تو بنتا ہے، آئینہ نہیں بنتا۔ پہلے

پہل آئینے دھات سے بنے۔ انسان کو یہ معلوم ہوا کہ صیقل کی ہوئی دھات میں بھی اس کی شکل نظر آتی ہے۔ جب اس نے اپنی شکل و صورت پر توجہ دینی شروع کی تو اپنا منہ دیکھنے کے لئے دھات کے آئینے بنائے۔

"آئینہ" فارسی لفظ ہے۔ محقق حضرات کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں "آہینہ" تھا، آہن، سے نکلا ہوا۔ آہن فارس میں لوہے کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ لوہے سے نکلا ہے۔ لوہے کو اتنا صاف کیا گیا کہ اس میں شکل دکھائی دینے لگی۔ یہ آئینہ بن گیا۔ اسی وجہ سے فارسی اور اردو شاعری میں آئینے میں جوہر تلاش کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ لوہے کا یہ آئینہ یونان کے بادشاہ اسکندر اعظم نے بنایا۔ ہماری شاعری میں اسی لئے آئینہ اسکندر اعظم سے وابستہ ہے۔

تاریخ سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ آئینہ، اسکندر اعظم کی ایجاد ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آئینے بہت قیمتی سمجھے جاتے تھے اور پرانے زمانے کے بادشاہ اور ملکہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ انتہائی چمک دار سونے اور چاندی کے ایسے آئینے ملتے تھے، جن کے ساتھ دستہ ہوتا اور جو آگے پیچھے گھمائے جاسکتے تھے۔ جب اپنا چہرہ دیکھتے دیکھتے دل بھر جائے تو آئینے کو پلٹ لیجئے، اور اس کی پشت پر بنے ہوئے نازک نقش و نگار کو سراہئے۔

سونے چاندی کے آئینے میں منہ دیکھنا تو ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ تانبے اور کانسی کے سستے آئینے عام تھے۔ قدیم روم میں ان کا استعمال بہت عام تھا۔ روم کے حجام آئینہ دکھانے اور آئینے کو صاف رکھنے کے لئے الگ سے غلام رکھتے تھے۔ آئینے کے ان غلاموں کا کام ہی آئینے پر پالش کرنا تھا۔

آئینے سے منہ دیکھنے کے علاوہ اور کام لینے کا سلسلہ زمانہ قدیم سے شروع ہو چکا تھا۔ یونان میں آئینے کے ذریعے آگ جلانے کا کام بھی ہوتا تھا۔ ان آئینوں کو "محرقے" کہا جاتا تھا، اور ان سے سورج کی شعاعیں ایک جگہ مرتکز کر کے آگ لگائی جاسکتی تھی۔ قدیم مصر میں ساحلوں کے محافظ ساحل کے اس اونچی جگہوں پر مینار تعمیر کر کے ان پر آئینے نصب کر دیتے تھے، اور ان آئینوں کے ذریعے آتی جاتی کشتیوں اور جہازوں کی نگرانی کرتے۔

دھات کے آئینوں کا رواج ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ میں بھی رہا۔ دھات کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت آئینے، خواتین اپنی کمر کے گرد باندھتی تھیں۔ گول آئینے کمروں میں لگائے جاتے، کیونکہ ان میں پورا کمرہ نظر آتا تھا۔

جن علاقوں میں دھات کا استعمال عام نہیں ہوا تھا، وہاں سلیٹ پر پالش کرنے سے آئینہ بنایا گیا۔ بعض علاقوں میں سیاہ رنگ کے آتش فشانی مادے کو چمکا کر آئینے کا کام لیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ آئینے سیاہ تھے۔

آئینے میں اجالا اس وقت ہوا جب ۱۳۰۰ء

کے لگ بھگ اطالیہ کے شہر وینس میں شیشے سے آئینہ بنانے کا طریقہ دریافت ہوا۔

وینس اس وقت تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، اور صنعت و فن کے بڑے بڑے باکمال یہاں موجود تھے۔ یہاں کسی ہنر مند کاریگر نے دریافت کیا کہ جست اور پارے کا مرکب شیشے کے اوپر لگا دیا جائے تو اس میں زیادہ بہتر عکس بنتا ہے اور روشنی اس میں چمکتی ہے۔ یہ آئینہ گری کی ابتداء تھی۔ اس کے بعد سے آئینے شیشے کے ہونے لگے۔

آئینہ، شیشے سے بننے تو لگا، مگر بے حد مہنگا ہوتا تھا۔ اُمرا اور رؤساء کے گھروں میں یہ قیمتی آئینے، آرائش اور زیبائش کے لئے لگائے جاتے تھے۔ یہ آئینے بہت چھوٹے ہوتے تھے، اور جڑاؤ فریم میں نصب کئے جاتے تھے۔ جیسے یہ کسی ماہر مصور کی بنائی تصویر ہوں۔ آئینے کو بے حد قیمتی سمجھا جاتا تھا اور آئینہ ساز اس کے بنانے کی ترکیب کو راز بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

سترھویں صدی میں آئینہ سازوں نے بڑے بڑے آئینے بنانے کا طریقہ دریافت کر لیا۔ اب وہ آئینے کی پوری پوری چادر بنانے لگے۔ اب قد آدم آئینے کا رواج ہو گیا۔ یوروپ کے شہزادے "آئینہ بند کمرے" تعمیر کروانے لگے جن کی دیواروں پر آئینے نصب ہوتے تھے، اور وہ ان کمروں میں کھاتے پیتے اور رقص کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر سراہ سکتے تھے۔ اب آئینہ خود بینی اور خود نمائی کا ذریعہ بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے پاس ایک بہت قیمتی آئینہ تھا جو چین سے آیا تھا۔ کسی کنیز سے وہ اتفاقاً گر کر ٹوٹ گیا۔ کنیز کو خوف ہوا کہ شہنشاہ آئینہ ٹوٹنے کے سزا دیں گے، مگر ان کو اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔ کنیز نے شہنشاہ کے سامنے جاکر مصرع پڑھا۔

صد حیف کہ آئینہ چینی بشکست

یعنی بہت افسوس کے آئینہ چینی ٹوٹ گیا۔

شہنشاہ نے مصرع پر مصرعہ لگایا

سامان خود بینی بشکست

یعنی، اپنے آپ کو دیکھتے رہنے کا سامان ٹوٹ گیا۔

یہ سامان خود بینی دیر تک ساتھ رہا۔ مغل شہنشاہوں نے شیش محل تعمیر کروائے۔ آگرہ کے قلعے میں ایک شیش محل بنوایا گیا تھا، جس میں قیمتی شیشے کے ٹکڑوں کو تراش کر کاری گروں نے چھت اور دیوار پر نقش و نگار بنائے تھے۔ صباح الدین عبدالرحمان کا بیان ہے کہ "اب بھی جب کہ یہ محل بالکل خستہ ہو چکا ہے، اس میں روشنی کی جاتی ہے۔ تو لاکھوں تارے چمکتے نظر آتے ہیں۔"

شیش محل کے پاس ایک حمام بنا ہوا ہے۔ حمام سے شاہی بیگمات سنگار کے لئے شیش محل میں آجاتی تھیں، اور وہاں شیشے کے سینکڑوں ٹکڑے اس زاویئے سے لگے ہوئے تھے کہ ہر ٹکڑے میں پورا عکس آجاتا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ملکہ ممتاز محل سنگار کے لئے اس محل میں آتی تو شاہ جہاں کو ایک

وقت میں سینکڑوں ممتاز محل نظر آتی تھیں۔ اپنی محبوب ملکہ کی یاد میں شاہ جہاں نے تاج محل تعمیر کروایا، اور جب اسے تخت سے معزول کر کے آگرے کے اسی قلعے میں قید کر دیا گیا تو اس نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹا سا آئینہ لگوا لیا تھا۔ جس میں پورا تاج محل سمٹا ہوا نظر آتا تھا۔ آئینے کا یہ عکس معزول اور مجبور شہنشاہ کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔

خود بینی کے بعد خود آگاہی کا مشکل مرحلہ آتا ہے۔ طلسم ہوش ربا کی دلچسپ اور حیرت انگیز داستان میں طلسماتی حجرۂ بلا کا ذکر ہے جن میں سے ایک اس قدر حسین و جمیل تھا کہ جو اس کو دیکھتا اس کا گرویدہ ہو جاتا اور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا۔ یوں پورا لشکر تباہ ہوا جا رہا تھا۔ عیاروں نے عیاری دکھائی اور تمام لباس پر آئینے سجا کر یعنی آئینہ پوش سوار بن کر اس کے سامنے گئے۔ وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اپنا ہی گرفتار ہو گیا اور اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ یوں افراسیاب کے لشکر کی جان بچ گئی۔ وہ بلا کا شہزادہ آئینے میں نظر بند ہوا اور آئینے دیکھنے کے سبب ہلاک ہوا۔

اسی لئے تو غالب نے کہا تھا کہ ڈرتا ہوں آئینے سے..... مگر آئینے کا کام صرف عکس تک محدود نہیں۔ دور بین میں نصب کئے جانے والے آئینوں نے آسمانوں کے اسرار، انسان کی آنکھ پر کھول دیئے ہیں۔ آئینہ عکس نہ دکھاتا تو خورد بین بھی کام نہ کرتی۔ خورد بین کے ذریعے جراثیم کو نظر میں لا کر ان کی پیدا کردہ بیماریوں سے جنگ لڑنا ممکن ہوا، اور مادے کے اندر جھانک کر جوہر اور اس کی بے پایاں توانائی کو دریافت کیا گیا۔ ان ہی عدسوں کو جوڑ کر عینک بنائی گئی۔ جس نے دھندلی نظر کو صاف کیا۔ گاڑی میں شیشے لگائے گئے جو دور تک آنے والی گاڑیوں کو سامنے رکھتے ہیں اور سفر کو محفوظ بناتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھئے تو آئینہ بڑے کام کی چیز ہے۔ ہمیں عجائبستان والی ایلس کی طرح آئینے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ آئینہ خود کیا کم دلچسپ اور عجیب ہے۔

عدم اور وجود

پنڈت ہری چند اختر نے عبدالحمید عدم کو ایک طویل مدت بعد کسی مشاعرہ میں دیکھا لیکن پہچانا نہیں کیونکہ عدم بہت فربہ اندام ہو چکے تھے۔ عدم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اختر صاحب پہچانے نہیں ان سے کہا "پنڈت جی! میں عدم ہوں۔" اختر صاحب نے بے ساختہ یہ شعر عرض کیا۔

انجامِ ملّتِ عاد و ثمود کیا ہوگا
اگر یہی ہے عدم تو وجود کیا ہوگا

زمین کا ردِ عمل

انوار اخگر اعوان

جب زمین کے اندر سے تیل نکالا جاتا ہے زمین اس پر دو طرح سے اپنے رد عمل کا اظہار کرتی ہے۔ پہلی صورت میں زمین کا وہ حصہ جہاں سے تیل نکالا جائے زمین کے اندر دھنسنا شروع ہو جاتا

آئل کمپلکس کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اس کے ارد گرد تعمیر کی گئی ۳۲ کروڑ کلو گرام وزنی دیوار

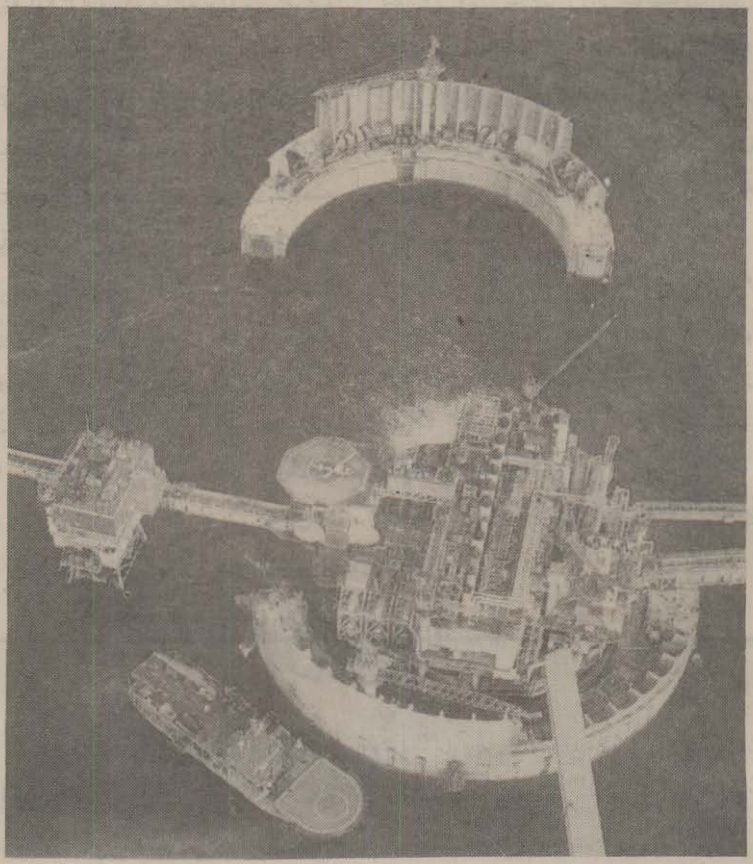

ہے۔ جیسا کہ ناورے کے ساحل سے ایک سو اسی میل سمندر کے اندر واقع فلپس پیٹرولیم کمپنی کا آئل کمپلیکس ۱۹ سال قبل زمین میں دھنسنا شروع ہوا۔ کمپلیکس ۱۹۸۹ء تک تقریباً ۱۲ فٹ نیچے جاچکا تھا۔ جس کے تدارک کے لئے کمپنی کو اس کے اردگرد کنکریٹ کی ساڑھے تین سو فٹ اونچی اور قریباً ۳۲ کروڑ کلو گرام وزنی دیوار تعمیر کرنا پڑی۔

لیکن دوسری قسم کا ردعمل ماہرین کے لئے معمہ بنا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ گزشتہ سال "سیگال" نامی ماہر ارضیات ۔نے اس کی سائنسی توجیہ پیش کر کے اسے حل کیا۔ یہ ردعمل ہمیں زلزلے کی صورت میں محسوس ہوتا ہے۔ تیل نکالنے سے زلزلے کے جھٹکوں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، یہ سوال ماہرین کے لئے غور طلب تھا۔ سیگال نے امریکہ اور کینیڈا کے متعدد تیل کے کنوؤں کا بغور اور تفصیل سے مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تیل کے ذخائر نہیں بلکہ ان کے اردگرد واقع چٹانیں زلزلوں کے جھٹکوں کا باعث بنتی ہیں۔ تفصیل اس کی کچھ یوں ہے کہ جہاں سے تیل نکالا جاتا ہے وہاں دراصل بڑی بڑی مسام دار چٹانیں ہوتی ہیں جن میں تیل بھرا ہوتا ہے۔ جب تیل ان میں سے کھینچ لیا جائے تو یہ اسفنج کے ٹکڑے کی مانند سکڑتی ہیں۔ مسام دار چٹانوں کے اس سکڑاؤ (CONTRUCTION) کی وجہ سے وہاں ایک قسم کا خلا (VACUUM) پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے پر کرنے کے لئے اردگرد کی چٹانیں کھنچتی چلی آتی ہیں۔ اور اس حرکت سے زمین میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اگر اوپر کی چٹانیں اس خلا کو پر کریں تو زمین نیچے کی طرف دھنس جاتی ہے اور اگر اطراف کی چٹانیں اس خلا کو پر کریں تو زمین ہلتی ہے اور ہمیں زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔

سیگال کے اس نظریئے نے اگرچہ زلزلوں کو روکنے کے سلسلے میں ماہرین کی کوئی رہنمائی نہیں کی لیکن اس کی وجہ سے اب تیل کے ذخائر کے محل وقوع کا قطعی پتہ چلانا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ امید پیدا ہوئی ہے کہ مستقبل میں "خلا" والی جگہ پر سوراخ کر کے اس خطرے کا تدارک کیا جا سکے گا۔

سعادت مند

جوش ملیح آبادی نے ایک مرتبہ مجاز سے پوچھا "کیا تمہارے والدین تمہاری روزانہ کی بے اعتدالیوں پر اعتراض نہیں کرتے؟" مجاز نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے اور جوش صاحب میری خوش نصیبی یہ ہے کہ میرے والدین سعادت مند ہیں۔"

ایاز محمود

دلچسپ

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

سوال :۔ ڈائنو سار کیا تھے اور وہ کہاں چلے گئے ہیں؟

جواب :۔ ہماری اس زمین کی عمر لگ بھگ ساڑھے چار ارب سال ہے۔ اپنی ابتدائی حالت میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی اور تمام کرہ ارض پر ایک نہ رکنے والی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ایک زمانے تک جاری رہا۔ یہ بارشیں اس تواتر سے ہوئیں کہ زمین کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ سمندروں، تالابوں، جھیلوں اور دریاؤں کی شکل میں غرق آب ہو گیا۔ ہماری زمین کے اولین جاندار پانی ہی میں پیدا ہوئے۔

زمانے گزرتے رہے اور ارتقاء کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ایسے جاندار وجود میں آئے جو پانی کے ساتھ ساتھ خشکی پر بھی رہ سکتے تھے۔ انہیں (Amphibian) یا جل تھلیے کہا جاتا ہے۔

جل تھلیوں کی بعض اقسام پانی سے دور خشکی پر رہنے لگیں اور وہیں اپنا مستقل گھر بنالیا۔ یہ رینگنے والے جاندار تھے جو جل تھلیوں کی نسبت زیادہ پھرتیلے تھے۔ ان جانداروں کو REPTILE یا ہوام کا نام دیا گیا۔

زمانہ قدیم کے عظیم الجثہ جانور جنہیں ڈائنو سار کہا جاتا ہے دراصل ہوام نسل سے وجود میں آئے۔ ان کی تقریباً پانچ ہزار اقسام تھیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے بڑے تھے کہ ہاتھی بھی ان

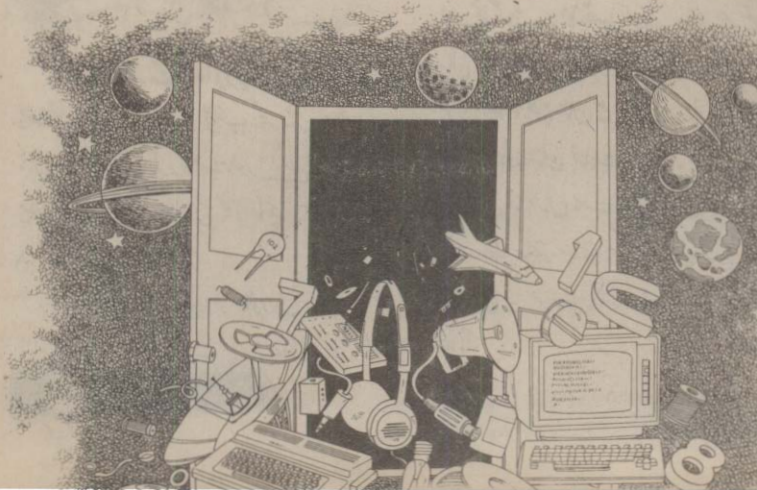

کے سامنے بونا لگے۔ یہ آج سے تقریباً بیس کروڑ سال پرانا دور ہے۔

ایک جانور جسے ٹائرانو سارس کا نام دیا ۲۵ فٹ اونچا اور ۴۵ فٹ لمبا تھا۔ ان جانوروں کی زیادہ تر قسمیں سبزی خور تھیں اور یہ درختوں کے پتے اور پودے وغیرہ کھا کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ اس کے برخلاف بعض ڈائنو سار نہایت وحشی اور جنگ جو تھے جو دوسرے جانوروں کو اپنا شکار بناتے تھے۔

اس زمانے کے ایک اور جاتور بران ٹوسارس کا ڈھانچہ امریکہ کے ایک عجائب گھر میں موجود ہے جس سے ان کے قد و قامت اور حلیئے کا بخوبی پتا چلتا ہے۔ بران ٹو سارس کا ڈھانچہ ۶۶ فٹ لمبا اور ۱۸ فٹ اونچا ہے۔

ان خوفناک اور دیو زاد جانوروں کے دور میں نہایت بڑی جسامت کے پرندے بھی ہوا کرتے تھے۔ آج کل کے پرندوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ ڈائنو سار آخر کہاں چلے گئے۔ تو بھائی اس کا جواب یہ ہے کہ وہ گذرتے ہوئے وقت اور موسمی اور ماحولیاتی تغیرات کا شکار ہوتے چلے گئے۔ یہ مرطوب اور دلدلی خطوں کے رہنے والے جانور تھے۔ آج سے تقریباً دس کروڑ سال پہلے دنیا کا موسم تبدیل ہونے لگا اور کرہ ارض بتدریج ٹھنڈا ہوتا گیا۔ ڈائنو سار ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود کو نہ ڈھال سکے اور آہستہ آہستہ بالکل ہی ختم ہوگئے۔ یہ تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے کی بات ہے۔

دیو زاد جانوروں کا ذکر ہو رہا ہے تو بلوچی تھیریم کا ذکر بھی سن لیجئے تم کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ نہایت بھاری بھرکم جانور اپنے بلوچستان کے گھنے جنگلوں میں پایا جاتا تھا۔ ۱۷ فٹ اونچا یہ جانور گینڈے سے مشابہت رکھتا تھا۔ اب ذرا ۱۷ فٹ اونچے گینڈے کا تصور کرو۔ ساڑھے تین کروڑ سال پرانے اس جانور کی ہڈیاں ۱۹۱۱ء میں ایک امریکی ماہر کو بلوچستان میں ملیں۔ بلوچی تھیریم کے دور میں بلوچستان نہایت گھنے اور مرطوب جنگلات پر مشتمل تھا جہاں بہت زیادہ بارشیں ہوتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ موسموں کی تبدیلی کے نتیجے میں آج یہ سرزمین خشک اور بے آب نظر آتی ہے۔

بلوچی تھیریم کا ذکر ہم نے تمہاری دلچسپی کے لئے بر سبیل تذکرہ کر دیا۔ اس کو ڈائنو سار سے مت ملانا۔ یہ تو دودھ پلانے والا جانور ہے جب کہ ڈائنو سار نسبتاً غیر ترقی یافتہ رینگنے والے جانوروں کی اعلیٰ نسل سے تھے۔

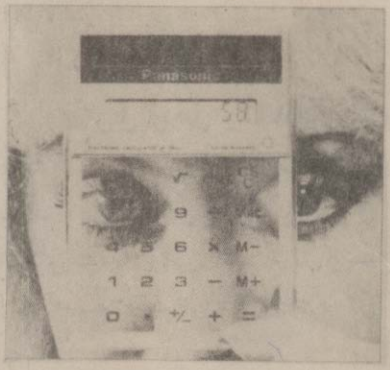

شفاف کیلکولیٹر

جاپان کی پینا سونک نامی کمپنی نے شیشے کی مانند انتہائی شفاف کیلکولیٹر بنایا ہے جس کے آر پار دیکھنا ممکن ہے اس میں استعمال ہونے والے تار اس قدر باریک ہیں کہ آسانی سے نظر نہیں آتے۔

سوال: پلاسٹک کیا ہے؟ اسے کیسے حاصل کیا جاتا ہے؟

(زبیر علی نواز۔ قاسم آباد، حیدر آباد)

پلاسٹک کے دو بنیادی اجزا کاربن اور ہائیڈروجن ہیں۔ ان میں اضافی کیمیائی اجزا کے ذریعے پلاسٹک میں بہت سی خصوصیات پیدا کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً اسے بے حد مضبوط بنایا جاسکتا ہے، ضرورت کے مطابق اس میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے یا ایسا پلاسٹک بنایا جاسکتا ہے کہ جس پر آگ اثرانداز نہ ہو۔

پلاسٹک جن سالموں سے مل کر بنتا ہے انہیں پولی مر کہتے ہیں۔ یہ بڑے سالمے ہوتے ہیں جو دیگر چھوٹے چھوٹے سالموں سے مل کر بنتے ہیں۔ ابتدا میں لوگ پلاسٹک کی صرف ایک قسم سیلیولائیڈ سے واقف تھے۔ سیلیولائیڈ کا خام مال پودوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بعد میں پلاسٹک کی دوسری قسمیں ایجاد ہوئیں مثلاً نائیلون، پولی تھین اور پولی وینائیل کلورائیڈ جسے عرف عام میں پی وی سی (PVC) کہا جاتا ہے۔

پلاسٹک بہت کام کی چیز ہے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑایئے۔ آپ پر واضح ہوجائے گا کہ یہ دور دراصل پلاسٹک کا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زنگ نہیں لگتا اور نہ ہی یہ گلتا اور سڑتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خوبی ایک مصیبت بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کا ضائع کرنا بہت مشکل کام ہے۔ کاغذ کی تھیلیاں اور لفافے تو کچھ عرصہ کے بعد گل سڑ کر ختم ہوجاتے ہیں مگر یہ پلاسٹک کی تھیلیاں گلنے اور سڑنے سے محفوظ ہیں لہٰذا ہمارے شہروں کا کوڑا بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کیلئے اب ایسا پلاسٹک ایجاد کرلیا گیا ہے جو اگر زمین میں دفن کردیا جائے تو کچھ عرصہ بعد خود ہی ختم ہوجاتا ہے۔

پلاسٹک کی بیشمار اقسام ہیں لیکن ان کے بنیادی

اجزا کاربن اور ہائیڈروجن ہی ہیں جنہیں خام تیل سے حاصل کیا جاتا ہے۔

سوال ..... اگر ہم چاند پر کھڑے ہوکر دنیا کو دیکھنا چاہیں تو ہمیں دنیا دیکھنے کیلئے اوپر آسمان کی طرف دیکھنا پڑے گا یا زمین کی طرف؟ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ چاند پر کھڑے ہوکر دنیا کو نیچے دیکھنے کے بجائے اوپر آسمان کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

سید منصور علی ..... کورنگی کراچی

جواب ..... یہ سوال آپ کے ذہن میں غالباً اس لئے پیدا ہوا کہ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہم زمین والے نیچے ہیں اور چاند اوپر کی سمت ہے۔ لہٰذا ہمیں چاند کو دیکھنے کیلئے سر اٹھا کر اوپر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس حساب سے تو امریکا والے الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور زمین چونکہ اپنے محور پر گھوم رہی ہے تو اگلے چکر میں وہ اوپر آجائیں گے اور ہم الٹے لٹکنے لگیں گے۔ تو بھائی یہ سارا جھگڑا اوپر اور نیچے کا ہے لیکن کائنات کی ہر شے سائنس کی رو سے اضافی (Relative) ہے۔ یہاں نہ کوئی اوپر ہے اور نہ کوئی نیچے۔ لہٰذا ہم چاند کو اوپر کی سمت میں دیکھتے ہیں جو زمین کے حوالے سے اوپر ہے تو چاند پر کھڑے ہوئے خلانورد زمین کو دیکھنے کیلئے اپنے طور پر اوپر ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

پانی اور خشکی کی گاڑی

جرمنی کی بنی ہوئی یہ 4WD جیپ نہ صرف سڑک پر ۸۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتی ہے بلکہ ۱۱ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پانی میں بھی چل سکتی ہے۔ اس طرح سے راستہ میں پڑنے والے چھوٹے موٹے دریا بآسانی عبور کر سکتی ہے۔

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نوابشاہ	۲۴۱۴
سعید بک سٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بکسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے

ماہ نامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ - سائٹ • کراچی ۱۶

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، کہ ملک چین میں شہنشاہ ایک چینی ہوتا ہے، اور اس کے ارد گرد بھی سب چینی ہی ہوتے ہیں..... خیر..... جو کچھ میں آپ کو بتانے لگا ہوں، یہ سالہا سال پہلے کا واقعہ ہے، اور اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اسے بہت غور سے سنیں۔

شہنشاہ کا محل دنیا میں سب سے زیادہ اور خوبصورت تھا۔ یہ محل بیش قیمت کانچ کا بنا ہوا تھا، اور اتنا نازک تھا، کہ اسے چھونا خطرے سے خالی نہ تھا۔

دنیا کے بہترین پھول محل کے باغ میں موجود تھے، اور پھولوں کی ہر شاخ پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں یوں بندھی ہوئی تھیں، کہ ہوا کے ہر جھونکے سے یہ گھنٹیاں ایک ترنم سے بجنے لگتیں۔ اور اس طرح کوئی شخص پھولوں کو دیکھے بغیر گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ جی ہاں شاہی باغ کا پتا پتا اور ڈالی ڈالی کمال قرینے اور سلیقے کا پتا دیتی تھی۔ اور یہ باغ اتنا وسیع تھا کہ..... شاہی باغبان کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ باغ کہاں ختم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس باغ سے گزر کر آگے نکل جاتا تو اسے بڑا خوش نما اور ہرا بھرا جنگل نظر آتا جو

سمندر کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ سمندر ساحل ہی پر کافی گہرا تھا اور بڑے بڑے جہاز درختوں کی شاخوں سے چھوتے ہوئے گزرتے تھے۔ ان شاخوں پر ایک بلبل رہتا تھا۔ جو اتنا میٹھا اور اتنا پیارا گاتا تھا کہ ایک غریب ماہی گیر جب رات کو مچھلیاں پکڑنے آتا تو وہ مبہوت کھڑا اس بلبل کا گانا سنتا رہتا۔ اور اس کی زبان بے اختیار نکل جاتا۔ "واہ کیسا پیارا گاتا ہے۔" لیکن پھر اسے اپنا کام یاد آجاتا اور وہ بلبل کو بھول جاتا لیکن دوسری رات کو پھر ماہی گیر دیر تک بلبل کا گانا سنتا رہتا - اور سر ہلاتے ہوئے کہتا۔ "واہ کتنا پیارا گاتا ہے۔"

دنیا کے ہر حصہ سے لوگ شہنشاہ کے اس مشہور شہر کو دیکھنے آتے تھے۔ وہ اس شہر، محل اور شاہی باغ کی بہت تعریف کرتے۔ ہاں اگر وہ کہیں اس بلبل کا گانا سن پاتے، تو پھر ان کے خیال میں سب سے شاندار بلبل کا گانا ہوتا۔ اور وہ اپنے ملک جاکر پھر اس بلبل کا ذکر بڑے پیار سے کرتے۔ کئی لوگوں نے شہنشاہ کے اس شہر، باغ اور محل کے متعلق کتابیں لکھیں مگر کسی نے بھی بلبل کو فراموش نہیں کیا۔ بلکہ بلبل کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا گیا۔ ان کتابوں میں لکھا تھا کہ بلبل خوبصورتی، حسن اور شان میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ اور کئی شاعروں نے جنگل کے اس بلبل کی تعریف میں طویل نظمیں لکھیں۔

ایسی کتابیں دنیا کے ہر بڑے شہر میں پہنچ چکی تھیں۔ آخر کار ایک ایسی کتاب شہنشاہ کے ہاتھ بھی لگ گئی۔ ایک طلائی کرسی پر بیٹھ کر شہنشاہ اس کتاب کو پڑھتے رہے۔ اور بار بار اپنا سر ہلاتے رہے۔ کیونکہ انہیں اپنے شہر، محل اور باغ کی تعریف پڑھ کر خوشی ہو رہی تھی، "مگر بلبل ان سے بھی شاندار یادگار ہے"..... یہ کتاب میں لکھا تھا۔

"ہیں یہ کیا۔" شہنشاہ نے حیرانگی سے کہا۔ "ایک بلبل..... لیکن ہم ایسا کوئی بلبل نہیں جانتے۔ کیا کوئی ایسا پرندہ ہماری سلطنت بلکہ ہمارے باغ میں ہو سکتا ہے۔ جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہ ہو۔ اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ سنا ہو۔ ہاں سچ ہے کہ کتابوں سے آدمی کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہے۔"

پھر انہوں نے اپنے وزیر اعظم کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ یہ وزیر اعظم صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ اور کوئی ادنیٰ درجے کا آدمی ان سے بات ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کوئی شخص ان سے کوئی سوال پوچھ بیٹھتا۔ تو ان کا جواب ہوتا۔ "پشا۔" اس لفظ کے کوئی خاص معنی نہیں تھے۔

"کہا جاتا ہے کہ ایک مخصوص قسم کا پرندہ، جس کا نام بلبل ہے، ہمارے ہاں موجود ہے۔" شہنشاہ نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس بلبل کا گیت میری تمام سلطنت کی ہر قیمتی اور نایاب شے سے بھی شاندار ہے اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ مابدولت کو اس کے متعلق آج تک کیوں نہیں بتایا گیا؟"

"میں نے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے کسی کو نہیں سنا۔ اور نہ آج تک اسے دربار میں ہی حاضر

کیا گیا ہے۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔

"مابدولت کی خواہش ہے کہ آج شام کو یہ بلبل ہمارے سامنے پیش کیا جائے اور ہمیں اپنے گانے سے محظوظ کرے۔ ازبر ہے کہ اک دنیا یہ جانتی ہو کہ ہمارے پاس کیا ہے۔ اور صرف ہم ہی ایسے ہیں کہ ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پاس بھی کوئی خاص شے موجود ہے۔" شہنشاہ نے کہا۔

"آج سے پہلے میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ لیکن اس کی تلاش کروں گا۔ اور اسے کہیں نہ کہیں سے لاکر حاضر کروں گا۔"

"مگر یہ بلبل ہو گا کہاں؟" وزیر اعظم یہ سوچتے ہوئے سیڑھیوں پر بھاگے۔ اور پھر اسی تیزی سے الٹے پاؤں نیچے اترے۔ اور دیوان خاص سے گزر کر دیوان عام میں آئے۔ پھر شاہی باغ کی روشوں پر بھاگتے پھرے۔ اور جس سے بھی ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی، تو وہ ان سے بلبل کے بارے میں ضرور پوچھتے تھے۔ لیکن ہر شخص نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ وزیر اعظم بھاگتے ہوئے شہنشاہ کے پاس آئے اور کہا۔

"جہاں پناہ! ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب لکھنے والی کی اپنی اختراع ہے۔ ورنہ یہاں ایسا کوئی پرندہ موجود نہیں۔ اعلیٰ حضرت اس کتاب کی باتوں پر توجہ نہ فرمائیں۔ کتابوں میں کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کالا جادو کہا جاتا ہے۔"

"مگر جو کتاب ہم نے پڑھی۔" شہنشاہ نے جواب دیا۔"وہ ہمیں عالی مرتب شہنشاہ جاپان نے بھیجی ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا ایک لفظ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ مابدولت بلبل کا گیت سننا چاہتے ہیں اور آج شام کو اسے ہمارے حضور میں حاضر ہونا چاہئے۔ اگر یہ بلبل موجود نہ ہو تو کھانا تناول کرنے کے بعد تمام درباریوں کو درّے لگائے جائیں گے۔"

"زنگ پی۔" وزیر اعظم نے کہا۔ اور ایک دفعہ پھر سیڑھیوں پر بھاگتے بھاگتے گئے۔ اور الٹے پاؤں نیچے اترے۔ اور دیوان عام سے گزر کر شاہی کی روشوں پر دوڑتے پھرے۔ نصف درباری ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی درّے کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ کئی سوالات، اس عجیب و غریب بلبل کے متعلق پوچھے گئے جس کو ایک دنیا جانتی تھی۔ مگر دربار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا۔ جو ان سوالات کا جواب دے سکتا۔ آخر درباریوں نے ایک غریب لڑکی سے پوچھا۔ جو شاہی باورچی خانہ میں چھوٹے موٹے کام کرتی تھی۔ اس لڑکی نے انہیں بتایا۔

"ہاں..... وہ بلبل..... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت اچھا گاتا ہے..... ہر شام کو جب میں شاہی دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑے اپنی مفلس اور بیمار ماں کے لئے لے جاتی ہوں، جو سمندر کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ وہاں سے واپسی پر جب ذرا ستانے کے لئے جنگل میں رکتی ہوں تو

بلبل کا گیت سنتی ہوں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری دکھی ماں مجھے چوم رہی ہو۔"

"اے شاہی باورچی خانہ کی ادنیٰ ملازمہ!" وزیر اعظم بولے "میں تمہیں شاہی باورچی خانہ میں مستقل ملازمت دِلا دوں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہیں جہاں پناہ شہنشاہ کو کھانا تناول فرماتے ہوئے دیکھنے کی اجازت مل جائے گی۔ اگر تم ہمیں بلبل کے پاس لے چلو۔ کیونکہ آج شام کو اسے دربار میں حاضر ہونا ہے!"

اس لڑکی کے ساتھ وزیر اعظم اور درباری بلبل کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں انہیں ایک گائے کے ڈکارنے کی آواز آئی۔

"واہ۔" خواجہ سرا بولے۔ "اب ہم اسے دیکھ سکیں گے بے شک اتنے چھوٹے سے جانور کے لئے اتنی بلند آواز نکالنا کمال ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی آواز میں پہلے کبھی سن چکا ہوں۔"

"نہیں..... یہ تو ایک گائے ہے۔ بلبل سے ہم ابھی کافی دور ہیں۔" شاہی باورچی خانہ کی معمولی ملازمہ نے کہا۔

اتنے میں ایک مینڈک ٹرّایا۔

"واہ کیا کہنے۔" درباری راہب نے کہا "میں نے اس کی آواز سنی۔ واقعی اس کی آواز عبادت خانوں کی گھنٹیوں سے ملتی جلتی ہے۔"

"نہیں۔ وہ تو مینڈک ٹرّا رہا ہے..... میرا خیال ہے کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے ہیں ابھی بلبل گانا شروع کر دے گا۔" لڑکی نے کہا۔

واقعی تھوڑی دیر کے بعد بلبل نے گانا شروع کر دیا۔

"وہ ..... وہ اس شاخ پر دیکھئے بلبل گا رہا ہے۔" لڑکی نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"کیا ایسا ممکن ہے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ کتنا حقیر معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مشہور اور بڑے آدمیوں کو دیکھ کر اپنا رنگ کھو چکا ہے۔" وزیر اعظم نے کہا۔

"ننھے بلبل! ہمارے شہنشاہ تمہارا گانا سننا چاہتے ہیں۔" لڑکی نے کہا۔

"بڑی خوشی سے سنیں۔" بلبل نے جواب دیا۔

اور پھر اس نے اتنا میٹھا، اتنا پیارا اور رس بھرا گانا شروع کیا کہ سننے والوں کے دل خوشی سے اچھلنے لگے۔

"اس بلبل کا گانا کیا ہے بس جلترنگ بجتا معلوم ہوتا ہے۔" وزیر اعظم نے کہا۔

"اور اس کے ننھے گلے کی طرف دیکھو، کیسے حرکت کر رہا ہے کیا یہ عجیب بات نہیں؟ ہم نے اس

سے پہلے کبھی بلبل کا گانا نہیں سنا۔ یہ دربار میں بڑی عزت حاصل کرے گا۔"
"کیا میں شہنشاہ کے لئے ایک اور گیت گا سکتا ہوں؟" بلبل نے پوچھا کیونکہ اس کے خیال میں درباریوں میں شہنشاہ بھی موجود تھے۔
"محترم بلبل اعظم! مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو دربار کی ایک خاص تقریب میں تشریف لانے کی دعوت دینے کی سعادت حاصل کر سکوں۔ یہ تقریب آج شام کو منعقد ہوگی۔ میں فخر سے آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ عالم پناہ شہنشاہ چین آپ کا گانا سن کر بڑے خوش ہوں گے۔" وزیر اعظم نے کہا۔
"میرے گیت ان ہرے بھرے درختوں ہی میں جچتے ہیں۔" بلبل نے جواب دیا۔
بہرحال جب بلبل کو بتایا گیا کہ شہنشاہ کو اس کا گانا سننے کی بڑی خواہش ہے تو اس نے دربار میں حاضر ہونے پر رضامندی ظاہر کی۔ تمام محل کو خوب سجایا گیا۔ در و دیوار اور کانچ کے فرش کو شیشے کی طرح چمکایا گیا۔ جب شام کو ہزاروں چینی فانوس روشن کئے گئے تو رنگ برنگ کی روشنیوں سے عجیب سماں پیدا ہو گیا۔ پھولوں کے پودے جن کی شاخوں پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں آویزاں تھیں۔ انھیں رستے میں دو رویہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس شام کو دربار میں اتنی چہل پہل تھی کہ پھولوں کی شاخوں پر بندھی ہوئی گھنٹیاں متواتر بجنے لگیں اور اس طرح کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔
دربار کے وسط میں شاہی تخت تھا، اس کے عین سامنے سونے کی ایک سلاخ گاڑی گئی۔ اور اس کے سرے کو اس طرح موڑ دیا گیا کہ بلبل کے بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔ شہنشاہ اپنے تخت پر رونق افزا ہوئے۔ درباری بہترین لباس پہنے درجہ بدرجہ بیٹھ گئے۔ باورچی خانہ کی اس معمولی خادمہ کو دروازے پر کھڑا ہونے کی اجازت مل گئی کیونکہ اب اسے شاہی باورچن کا خطاب اور عہدہ مل چکا تھا۔
دربار میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ تمام درباریوں کی نظریں بلبل پر جم گئیں۔ اور جونہی شہنشاہ نے اپنے سر سے اشارہ کیا تو بلبل نے گانا شروع کر دیا۔
اس نے اتنی پیاری اور دل گداز آواز میں گایا کہ شہنشاہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔ درباریوں پر بھی بلبل کے گانے کا گہرا اثر ہوا۔ شہنشاہ نے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے حکم دیا۔
"میری خاص سونے کی زنجیر بلبل کو انعام میں دی جائے اور بلبل اس زنجیر کو اپنے گلے میں باندھ لے۔"
بلبل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو پہلے ہی انعام مل چکا ہے۔ "میں نے شہنشاہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں اور میرے لئے یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ شہنشاہ کے آنسو نایاب چیز ہیں۔

خدا جانتا ہے کہ اب مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

اس کے بعد بلبل نے ایک اور گیت گایا۔

"شہنشاہ کی توجہ حاصل کرنے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔" دربار کی بیگمات نے کہا۔ اور پھر ہر ایک نے اپنے منہ میں پانی ڈال کر بلبل کی مانند گلے کو حرکت دی اور وہ سمجھنے لگیں کہ بلبل کی طرح ان کی آواز بھی سریلی اور جاذبِ توجہ ہو جائے گی۔

اور ہاں پہرے دار اور کنیزوں نے بھی کہا کہ انھیں بلبل کے گانے سے بڑا لطف آیا۔ اور یہ سب سے اہم بات تھی کیونکہ دنیا میں یہی لوگ بڑی مشکل سے خوش ہوتے ہیں۔

دراصل بلبل کی یہ کامیابی یادگار ثابت ہوئی۔ اور اب بلبل دربار ہی میں رہنے لگا۔ اس کے لئے خاص سونے کا ایک پنجرہ بنایا گیا اور اسے اجازت دی گئی کہ دن میں دو بار اور رات کو ایک بار پنجرے سے باہر جا سکتا ہے۔ بارہ خدمت گار بلبل کے لئے مقرر کئے گئے۔ ایک چھڑی پر نایاب ریشم چڑھایا گیا اور ریشمی چھڑی پر پنجرے کو باندھ دیا گیا۔ خدمت گار اس چھڑی کو اٹھائے محل کے اندر باہر پھرتے رہتے تھے مگر اس اہتمام سے بلبل کو کوئی خوشی حاصل نہ ہو سکی۔

شہر میں اس عجیب بلبل کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اگر بازار میں دو چینی ملتے، تو ایک کہتا "بل" اور دوسرا جواب دیتا "بل" اور پھر دونوں ایک آہ بھرتے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کا مطلب سمجھ جاتے۔ شہریوں نے گیارہ بچوں کا نام بلبل رکھا مگر افسوس ان میں سے کسی کا بھی گلا بلبل کی طرح سریلا نہ تھا۔

ایک روز کافی بڑا اور وزنی پارسل شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس پر لکھا تھا۔

"بلبل۔"

"لو ایک اور کتاب ہمارے مشہور پرندے کے متعلق آئی ہے۔" شہنشاہ نے کہا۔ مگر پارسل میں کتاب نہ تھی۔ بلکہ اس میں ایک کل دار پرندہ تھا۔ جب پارسل کھولا گیا... تو اس میں سے ایک مشینی بلبل نکلا۔ جو بالکل اصلی بلبل سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے پروں پر موتی اور پنے جڑے ہوئے تھے۔ جب اس مصنوعی بلبل کی چابی بھری گئی تو وہ اصل بلبل کی مانند گانے لگا۔ مگر اس کا گانا صرف ایک ہی تان پر ختم ہوتا تھا۔ گاتے وقت اس کی دم بار بار اٹھتی تھی۔ اس کی گردن میں ایک نفیس ریشمی فیتہ بندھا ہوا تھا۔ جس پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ "شہنشاہ جاپان کے اس بلبل کے سامنے شہنشاہ کا بلبل معمولی ہے۔"

"یہ تو بڑے معرکے کی شے ہے۔" ہر ایک نے یہی کہا۔ اور جو شخص اس مصنوعی بلبل کو لایا تھا۔ اسے "شاہی بلبل بردارِ اعظم" کا خطاب دیا گیا۔

"اب یہ دونوں بلبل مل کر گائیں گے۔ اور اس طرح ہم دو گانا سنیں گے۔" پھر دونوں بلبلوں نے مل کر گایا مگر یہ دو گانا کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ اصل بلبل تو اپنے طریقہ پر گاتا تھا اور مصنوعی بلبل کی تان مشینی تھی، جو ایک ہی لے پر ختم ہوتی تھی۔

"یہ تو اس کا قصور نہیں۔ یہ تو مشین کے اصول کے مطابق گاتی ہے۔" درباری فن کار نے کہا۔

پھر مصنوعی بلبل کو اکیلا گانے دیا گیا۔ اس کا گانا سن کر سب درباریوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور اس طرح بلبل کو بھی دربار میں بڑی کامیابی اور عزت حاصل ہوئی۔ یہ کل دار بلبل اصل بلبل سے خوبصورت تھا۔ اس کے سر پر چھوٹی سی مصنوعی کلغی پر ایک ہیرا چمک رہا تھا۔

تیس اور تین مرتبہ اس بلبل نے ایک ہی تان پر گایا۔ لیکن پھر بھی تھکا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی اس کی آواز میں کوئی فرق پڑا۔ بہر حال شہنشاہ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اب اصل بلبل گانا سنائے۔

مگر وہ کہاں تھا؟ کسی نے بھی یہ بتانے کی جرأت نہ کی کہ اصل بلبل کھڑکی سے اڑ گیا تھا۔ اور اب وہ اپنے سرسبز جنگل میں تھا۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟" شہنشاہ نے ناراض ہو کر پوچھا۔ اور تمام درباری بلبل کو کوسنے لگے۔ ہر ایک نے اسے ناشکرا پرندہ کہا۔ "ہمارے پاس ہمیشہ کے لئے بہترین پرندہ موجود ہے۔" درباریوں نے کہا۔ اور پھر تیس اور چوتھی بار اس کل دار بلبل کا گانا سنا گیا، مگر پھر بھی درباری اس کے گانے کو یاد نہ رکھ سکے کیوں کہ یہ گانا کافی مشکل تھا۔ درباری فن کار نے کہا۔ "کہ یہ بلبل ہر لحاظ سے اصل بلبل سے بہتر ہے۔ ظاہری صورت نایاب جواہرات سے مزیّن ہے۔ اور باطنی لحاظ سے بھی باکمال ہے۔"

"عالم پناہ اور معزز درباریو! ملاحظہ فرمائیے کہ اصل بلبل کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ کیا گائے گا۔ مگر اس کل دار پرندے کے متعلق ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی تان اور لے میں گائے گا۔ دوسری تان تو وہ جانتا ہی نہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی اندرونی کل بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ننھے ننھے پہیے کہاں لگے ہوئے ہیں اور کیسے گھومتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ کیسے مل کر چلتے ہیں۔" درباری فن کار نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ہر درباری نے کہا۔ فن کار کو اجازت مل گئی کہ اتوار کو وہ اس کل دار بلبل کا گانا عام شہریوں کو سنائے۔ "ہمارے شہریوں کو بھی اس بلبل کا گانا سننا چاہئے۔" شہنشاہ نے کہا۔

اس طرح عام لوگوں نے بھی اس کل دار بلبل کا گانا سنا۔ اور اتنے خوش ہوئے جیسے کہ چائے پی رہے ہوں۔ کیوں کہ چینی چائے پی کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ تمام لوگوں نے واہ واہ کے نعرے لگائے۔ اور اپنی انگلی اٹھا کر سر ہلانے لگے۔ لیکن ماہی گیر جو اصل بلبل کا گانا سن چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس مصنوعی بلبل کا گانا بڑا پیارا ہے۔ اور تقریباً اصل بلبل کے گانے سے ملتا جلتا ہے۔ مگر اس کے گانے میں کسی چیز کی کمی ضرور ہے۔ وہ چیز کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔"

شہنشاہ نے اصل بلبل کے لئے جلا وطنی کا حکم صادر کر دیا۔ اور پھر مصنوعی پرندے کو شہنشاہ کی کرسی کے پاس ریشم کے تکیے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پاؤں میں سونا اور چاندی بطور نذرانہ ڈال دیئے گئے۔ اسے "شاہی گویا" کا خطاب اور عہدہ دیا گیا۔ دربار میں یہ کل دار بلبل بائیں طرف رکھا جاتا کیوں کہ شہنشاہ کا خیال تھا۔ کہ جس طرف دل ہوتا ہے، وہ بڑی عزت کی جگہ ہوتی ہے۔ اور عام لوگوں کی طرح شہنشاہ کا دل بھی بائیں طرف تھا۔

درباری فن کار نے اس مصنوعی پرندے کے متعلق چینی زبان کے مشکل ترین اور طویل تر الفاظ میں پچیس جلدیں لکھیں۔ اور سب درباریوں نے کہا کہ انہوں نے تمام جلدوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور انہیں بخوبی سمجھ بھی گئے ہیں۔ اگر وہ یہ نہ کہتے تو انہیں بے وقوف سمجھا جاتا۔ اور شاید انہیں درّے بھی لگائے جاتے۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ شہنشاہ کے درباریوں اور دیگر سب چینیوں کو مصنوعی پرندے کا گیت زبانی یاد ہو گیا۔ اور یہی وجہ تھی، کہ انہیں یہ گیت بہت پسند تھا۔ بازاروں میں ننھے ننھے چینی لڑکے بلند آواز میں گاتے۔

"زی۔ زی۔ کلک۔ کلک۔ کلک۔ زی۔ زی۔"

شہنشاہ بذات خود بھی گیت گاتے۔ جی ہاں یہ گیت بڑا ہی پیارا تھا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ شہنشاہ اپنے بستر پر لیٹے اس کل دار پرندے کا گیت سن رہے تھے کہ ایک دم پرندے سے "بے نگ" کی آواز آئی۔ اور پھر کچھ کھڑ کھڑ اور فرفر کے ساتھ تمام ننھے ننھے پہیے اکٹھے چلنے لگے۔ اور اس کا گانا بند ہو گیا۔

شہنشاہ یک لخت بستر سے اچھل پڑے اور پھر اپنے خاص طبیب کو فوراً طلب کیا۔ مگر یہ طبیب کیا کر سکتا تھا۔

گھڑی ساز کو بلایا گیا۔ اور آخر بڑے بحث و مباحثہ اور بڑی کوشش کے بعد اس پرندے کو کچھ ٹھیک کیا گیا۔ گھڑی ساز نے بتایا کہ اس کل دار بلبل کو اب زیادہ گانے نہ دیا جائے۔ کیوں کہ اس کے

پرزے کافی گھس چکے ہیں۔ اور یہ پرزے نئے نہیں بن سکتے۔ اور نہ ہی اس کی آواز بہتر ہو سکتی ہے۔

اس افسوسناک واقعہ کا سب کو بڑا دکھ ہوا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سال میں ایک بار اسے گانے دیا جائے۔ تاہم کوئی نہ کوئی مشکل پیش آ ہی جاتی۔

لیکن درباری فن کار نے مشکل اور طویل الفاظ میں ایک تقریر کی اور کہا کہ یہ مصنوعی پرندہ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار ہے۔

پانچ سال کے بعد سلطنت میں ایک نئی مصیبت آ پڑی۔ رعایا اپنے شہنشاہ کو بہت چاہتی تھی۔ مگر بدقسمتی سے وہ سخت بیمار ہو گئے۔ اور یہ عام خیال پایا جاتا تھا کہ اب وہ بستر سے زندہ سلامت نہیں اٹھ سکیں گے۔ اس لئے ان کی جگہ نیا شہنشاہ بھی منتخب کر لیا گیا۔ محل کے باہر لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ جو وزیر اعظم سے پوچھ رہا تھا۔ کہ "اب شہنشاہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پشا" وزیر اعظم نے جواب میں کہا۔ اور اپنا سر ہلانے لگے۔

شہنشاہ کا سرد اور زرد جسم شاندار مسہری پر پڑا تھا۔ ان کے سب خدمت گار یہ سمجھتے ہوئے، کہ ان کا آخری وقت آ چکا ہے۔ وہ نئے شہنشاہ کو مبارک باد دینے چلے گئے۔ اور اس دوران میں کنیزوں نے شاہی باورچی خانہ میں ایک مزے کی چائے پارٹی اڑائی۔

محل کے تمام کمروں اور برآمدوں میں موٹے موٹے قالین بچھا دیئے گئے تھے۔ تاکہ چلنے سے آواز پیدا نہ ہو سکے۔ اس لئے محل میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مگر شہنشاہ تو ابھی زندہ تھے۔ ان کا جسم اکڑ چکا تھا۔ ان کا چہرہ ہلدی کی مانند زرد تھا۔ دروازے پر پردے لٹک رہے تھے۔ دریچہ سے چاندنی شہنشاہ اور اس کے مصنوعی بلبل پر پڑ رہی تھی۔ بے چارے شہنشاہ مشکل سے سانس لے سکتے تھے۔ ایک دم انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کی چھاتی پر بیٹھا ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو چھاتی پر موت بیٹھی تھی۔ جس نے شہنشاہ کا تاج اپنے سر پر رکھا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں شاہی خنجر اور دوسرے ہاتھ میں شاہی عصا اٹھا رکھا تھا۔ پردوں کے نیچے سے عجیب و غریب صورتیں نکل کر شہنشاہ کو گھورنے لگیں۔ چند شکلیں انتہائی بدصورت اور مکروہ تھیں۔ اور چند خوبصورت تھیں۔ دراصل یہ شکلیں شہنشاہ کے نیک و بد اعمال تھے۔ جو ان کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ اور موت ان کی چھاتی پر بیٹھی تھی۔

"کیا تم یہ جانتے ہو؟ کیا تمہیں یہ بات یاد ہے؟" وہ صورتیں شہنشاہ کو اس طرح کوسنے لگیں کہ آخر شہنشاہ کا پسینہ چھوٹ گیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں....." شہنشاہ چیخے۔ "گانا..... گانا..... مجھے گانا سناؤ۔ نقارے زور زور سے بجاؤ۔ مجھے خوفناک آوازوں سے بچاؤ۔"

لیکن وہ خوفناک صورتیں اپنے سوالات سے شہنشاہ کو ڈراتی رہیں۔ اور موت ان کی چھاتی پر بیٹھی، چینی انداز میں ان کے ہر لفظ پر اپنا سر ہلاتی رہی۔

"موسیقی! موسیقی!" شہنشاہ پھر چیخے۔ "پیارے مصنوعی پرندے، التجا کرتا ہوں، مجھے گیت سناؤ، میں نے تمہیں ہیرے اور جواہرات سے نوازا ہے۔ میں نے تمہیں اپنے گلے کی خاص زنجیر بھی عطا کی۔ اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ گانا سناؤ۔!"

مگر پرندہ خاموش رہا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ جو اس کل دار بلبل کی چابی بھرے اور چابی کے بغیر وہ گا نہیں سکتا تھا۔ موت خوفناک اور خالی خالی آنکھوں سے شہنشاہ کو گھور رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی ہی ہولناک خاموشی۔

یک لخت کھڑکی سے ایک نہایت ہی پیارا گیت سنائی دیا۔ یہ گیت اس ننھے بلبل کا تھا۔ جس نے شہنشاہ کی خطرناک بیماری کا حال سنا۔ تو فوراً محل میں پہنچا۔ اور اب کھڑکی کے باہر درخت پر بیٹھا، امید اور سکون کا گیت گا رہا تھا۔ اس گیت کو سن کر پردوں کے نیچے وہ خوفناک صورتیں زرد ہونے لگیں۔ اور پھر غائب ہو گئیں۔ شہنشاہ کے جسم میں آہستہ آہستہ خون دوڑنے لگا۔ موت نے کہا۔ "ننھے بلبل گائے جاؤ! گائے جاؤ!"

"کیا آپ مجھے یہ شاندار سنہری خنجر عطا فرمائیں گی؟ کیا آپ مجھے یہ شاہی نشان دیں گی؟ اور کیا آپ مجھے شہنشاہ کا تاج دیں گی؟" بلبل نے پوچھا۔

اور موت نے یہ سب چیزیں واپس لوٹا دیں۔

پھر بلبل نے قبرستان کے متعلق ایک گیت گایا۔ جہاں سفید گلاب کھلے ہوتے ہیں۔ اور جہاں موتیے اور چنبیلی کے پھول فضا میں اپنی خوشبو بکھیرتے ہیں۔ یہاں ہری بھری گھاس ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے پیارے دوستوں کے غم میں شبنم کے آنسو بہاتی ہے۔

یہ گیت سن کر موت کو قبرستان کے باغ میں جانے کی خواہش ہوئی۔ اور سرد اور سفید سائے کی شکل میں کھڑکی کی راہ سے چلی گئی۔

"شکریہ شکریہ!" شہنشاہ نے کہا۔ "اے مہربان ننھے بلبل تمہارا شکریہ۔ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اپنی سلطنت سے نکال دیا تھا۔ مگر تم نے میرے بستر سے بد روحیں دور کی ہیں اور میرے دل سے موت کے سایہ کو بھی ہٹا دیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں تجھے کیا انعام

دوں؟"

"آپ تو پہلے ہی مجھے انعام دے چکے ہیں۔" بلبل نے جواب دیا۔ "جب میں نے پہلے پہل آپ کے لئے گایا۔ تو میں نے آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ان آنسوؤں کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ موتی ہیں۔ جو ایک مغنی کے دل کو طاقت اور اس کی روح کو تازگی بخشتے ہیں۔ خیر۔ اب آپ سو جائیے۔ اور صبح تازہ دم اور تندرست ہو کر بستر سے اٹھئے۔ اب میں آپ کو لوری سناتا ہوں۔"

پھر بلبل نے ایک ایسی میٹھی لوری سنائی، کہ شہنشاہ کو گہری اور میٹھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ نیند کتنی مہربان تھی۔

صبح جب شہنشاہ کی آنکھ کھلی، تو سورج کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اب وہ بالکل تندرست تھے۔ لیکن ابھی تک کوئی خدمت گار کمرے میں نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ وہ تو انہیں مردہ یقین کر چکے تھے۔ بلبل کھڑکی کے باہر شاخ پر بیٹھا صبح کا گیت گا رہا تھا۔

"تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہو۔" شہنشاہ نے بلبل سے کہا۔ "جب تمہارا جی چاہے، تو مجھے گیت سنا دینا۔ میں اس مصنوعی پرندے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"ایسا مت کیجئے۔" بلبل نے جواب دیا۔ "یہ مصنوعی بلبل جو کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے وہ کیا۔ اب آپ اسے حفاظت سے رکھئے۔ میں محل میں نہیں رہ سکتا۔ البتہ مجھے یہاں آنے کی اجازت ملنا چاہئے۔ میں ہر شام یہاں بیٹھ کر آپ کو گیت سناؤں گا۔ تاکہ آپ خوش اور رحم دل رہیں۔ میں آپ کے لئے خوشی اور غم، آنسو اور مسکراہٹ، نیکی اور بدی کے گیت گاؤں گا۔ آپ سے جو اوجھل رہتا ہے۔ میں اس کے متعلق گیت گاؤں گا۔ میں ننھا مغنی دور دراز کا سفر کرتا ہوں۔ ماہی گیر کی جھونپڑی اور کسان کی کٹیا میں بھی جاتا ہوں۔ اس طرح دور دور کی خبریں آپ کے لئے لاؤں گا۔ مجھے آپ کے تاج سے زیادہ آپ کا دل عزیز ہے۔ حالاں کہ تاج بھی مقدس چیز ہے۔ میں آؤں گا، اور آپ کے لئے نت نئے گیت لاؤں گا۔ مگر آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔"

"ایک نہیں کئی....." شہنشاہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اور اپنے ہاتھ سے شاہی لباس پہننے لگے۔

"وعدہ یہ ہے کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو، کہ آپ کے پاس ایک پرندہ آتا ہے جو آپ کو دور نزدیک کے حالات سے آگاہ رکھتا ہے۔ یہی بہتر ہو گا۔" یہ کہہ کر بلبل اڑ گیا۔

خدمت گار مردہ شہنشاہ کو دیکھنے آئے۔ اور جب وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے، تو شہنشاہ نے ان سے کہا۔ "صبح بخیر!"

قصّہ گو

ترجمہ: منیر احمد / نثار احمد

ایک دفعہ ایک بادشاہ کے حضور میں عرض کیا گیا کہ شہر میں ایک بڑا لائق داستان گو ہے۔ یہ شخص قصے کہانیوں کا ایسا تار باندھتا ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شخص صبح سے شام تک لگاتار داستانیں سناتا چلا جاتا ہے اور شام سے رات گئے تک برابر ان سنی کہانیاں کہتا چلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں وہ ایک بار جو کہانی سنائے اسے کبھی نہیں دہراتا۔ ایک دن بادشاہ نے اسے دربار میں بلایا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"ہم نے سنا ہے کہ تم ملک کے سب سے بڑے داستان گو ہو، کیا وجہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے

تمہارا نام نہیں سنا؟"

اس شخص نے کہا "مجھے اپنی بڑائی کا دعویٰ نہیں، میں قہوہ خانوں میں اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لئے اپنی پسندیدہ کہانیاں سنایا کرتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا "بس رہنے دو اس جھوٹی کسر نفسی سے کوئی فائدہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم طرح طرح کے قصے کہانیاں سنایا کرتے ہو اور انہیں ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پہلے تم کچھ کھا پی لو اس کے بعد تم سے کوئی کہانی سنیں گے۔" کھانا کھانے کے بعد اس شخص کو دوبارہ بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔

بادشاہ نے کہا۔ "اگر ہم تم سے کوئی ایسی کہانی سننا چاہیں جو صبح تک ختم ہو اور جس کی ہر بات سچی ہو تو غالباً تم سنا سکو گے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمہاری لیاقت کی صحیح پرکھ نہیں، کیوں کہ ایسی کہانیاں اور قصہ گو بھی سنا سکتے ہیں۔ ہم تو تم سے ایسی کہانی سننا چاہتے ہیں جو بہت مختصر ہو اور اس کی ہر بات جھوٹی ہو۔ اگر ہمیں ذرا بھی شبہ ہوا کہ اس کہانی میں کوئی جملہ بھی سچا ہے۔ تو ہم تم کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ ہاں اب تم کہانی شروع کر سکتے ہو۔"

داستان گو بادشاہ کی یہ شرط سن کر پہلے تو کچھ ہچکچایا کیونکہ تھوڑی دیر تک لگاتار کوئی بات بھی ایسی کہتے رہنا بہت مشکل ہے جس میں کہیں بھی سچائی اور اصلیت نہ آنے پائے، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے کہانی سنانا شروع کی۔

"اے بادشاہ اعظم! میں آٹھ سال کا تھا کہ میرا والد پیدا ہوا۔ میرے دادا نے اس کو میری گود میں ڈال دیا اور کہا کہ میں اسے رونے نہ دوں مگر وہ رونے لگا، میں نے ہزار جتن کئے مگر وہ چپ نہ ہوا۔ آخر کار اس نے بازار چلنے کی ضد کی اور میں اس کو لے گیا، وہاں جا کر وہ کچھ بحال ہوا کیونکہ اس نے کچھ لوگوں سے اہم سیاسی مسئلوں پر بحث مباحثہ کرنا شروع کر دیا۔ ہم ابھی بازار ہی میں تھے کہ اس نے مجھ سے تازہ انڈا خریدنے کی فرمائش کی، انڈا خرید کر اس کو دیا ہی تھا کہ انڈے میں سے ایک بڑا چوزہ نکل پڑا ہم دونوں چلتے چلتے بہت تھک گئے تھے۔ اس پر سوار ہو کر گھر چل دیئے، گھر پہنچتے پہنچتے وہ چوزا اتنا بڑا ہو گیا کہ بالکل اونٹ معلوم ہوتا تھا تو مجھے اپنے باپ کو اپنے دادا کے حوالے کرنا پڑا۔

چونکہ میرا باپ میرا بھائی بھی تو تھا اور میرا باپ بھی۔" بادشاہ کو اس بے سروپا جھوٹ پر سخت غصہ آنے لگا۔ داستان گو کہانی سناتا رہا اس نے آگے بیان کیا "اس چوزے کا ہاضمہ غضب کا تھا وہ اتنا زیادہ کھاتا کہ ہم بھوکے رہنے لگے آخر کار ہم نے اسے کام پر لگا دیا۔ چونکہ چوزہ میرے باپ کی ملکیت تھا اس لئے وہ روزانہ صبح اسے جنگل لے جاتا اور اس پر جلانے کی لکڑیاں لاد کر گھر لے آتا۔ یہاں تک کہ ہمارے مکان کا صحن لکڑیوں سے بھر گیا اور اس دوران چوزے کی پیٹھ لکڑیوں سے چھل کر زخمی ہو گئی۔

میرے دادا کو اس کی بڑی فکر ہوئی آخر انہوں نے اپنی پڑدادی سے علاج کی ترکیب پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ اخروٹ کے بیج کی لپڑی بنا کر چوزے کی پیٹھ پر باندھ دو۔ انہوں نے وہ لپڑی باندھی دوسرے دن جب وہ اٹھے تو چوزہ ہٹا کٹا تھا مگر اس کی پیٹھ پر اخروٹ کا درخت اُگ آیا تھا۔

تین دن کے بعد وہ درخت بہت بڑا ہو گیا اور جہاں کہیں چوزہ جاتا وہ جھولتا ہوا اس کے ساتھ ہوتا۔ ہفتہ بھر کے اندر اس درخت کی شاخوں میں اخروٹوں کے ڈھیر لگنے لگے، حال یہ تھا کہ ایک درجن آدمی ان اخروٹوں کو توڑنے اور جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے انہیں اس کام میں چھ دن لگ گئے۔ اس درخت کی شاخیں بڑھتے بڑھتے اتنی لمبی ہو گئیں تھیں کہ اخروٹ توڑنے والے جو صبح کو درخت پر چڑھے تھے وہ اترنے لگے تو ان کے نیچے پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔"

بادشاہ نے بڑے غصے سے اپنا سر ہلایا، داستان گو کہتا رہا "جب اخروٹ چننے کا کام ختم ہوا تو میں نے یہ دیکھنے کے لئے درخت کے چاروں طرف چکر لگایا کہ کہیں کچھ اخروٹ باقی تو نہیں رہ گئے ہیں اور اس کام میں مجھے سارا دن لگانا پڑا، میں فارغ ہو کر جانے لگا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ چوزہ درخت کی شاخوں پر بیٹھا ہے میں نے زمین سے ایک ڈھیلا اٹھا کر اس کو دے مارا وہ ڈھیلا درخت کے اوپر چلا گیا اور پھر نیچے نہیں آیا۔ اس نے پھیلتے پھیلتے سارے درخت کی چوٹی کو گھیر لیا اور پھر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ ہوا میں چوٹی پر کوئی چالیس ایکڑ زمین کھیتی کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ میرے دادا نے اور میں نے اس زمین میں تل کے بیج بوئے، لیکن ایک مہینے کے بعد پتا چلا کہ ایک دانہ بھی نہ اگ سکا۔ ہمسایوں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی یعنی میرے باپ کو درخت کی چوٹی پر سے تل کے تمام بیج نکال کر لانے کا کہا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم دونوں تمام بیج نکال کر لے آئے لیکن بیج گنے تو ایک بیج کم تھا، ہم دوبارہ اس کی تلاش میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک ننھی سی چیونٹی اس کو کھینچتے ہوئے اپنی پہاڑی پر لے جا رہی تھی میں نے بیج کو پکڑا مگر چیونٹی نے بیج کو نہیں چھوڑا ہم تین سال لڑتے رہے، آخر کار تل کے دانہ کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس میں سے اتنا تیل نکلا کہ بہتے تیل کا دریا بن گیا اور کسان اس میں کشتیاں چلانے لگے۔"

بادشاہ جزبز ہونے لگا داستان گو نے آگے کہنا شروع کیا "اچانک ایک بہت بڑا طوفان آیا میں اور میرے دادا جلدی سے کود کر اپنے باپ کے دانت کے سوراخ میں گھس گئے، کوئی تین سال کم پچاس دن وہ طوفان جاری رہا۔ آخر ہم نے دانت سے باہر جھانک کر دیکھا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی اور چالیس ایکڑ زمین ساری بہہ چکی تھی اب ہم سب ہوا میں معلق تھے خیریت یہ ہوئی کہ میرے باپ اپنے ساتھ ایک رسی لائے تھے ہم نے اس رسی کو پکڑ کر نیچے اترنا شروع کیا اور صحیح سلامت گھر پہنچ گئے۔"

بادشاہ نے یہ دیکھ کر یہ کہانی ختم ہونے کو ہے اس سے کہا "اے داستان گو تم نے بڑی شاندار سرگزشت سنائی ہے اب یہ بتاؤ کہ آیا یہ داستان سچی ہے یا بناوٹی؟" داستان گو نے جواب دیا "عالی جاہ! یہ کہانی شروع سے لے کر آخر تک سب کی سب سچی ہے۔" بادشاہ نے کہا "اگر یہ کہانی سچی ہے تو تم میرے حکم کی تعمیل میں ناکام رہے کیونکہ میں نے تم سے ایسی کہانی سنانے کو کہا تھا جس کا ایک فقرہ بھی سچا نہ ہو۔

اس شخص نے ہنس کر کہا "بادشاہ اعظم! میں نے آپ کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی ہے اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ یہ کہانی سچی ہے وہ بھی آپ کے حکم کی بنا پر جھوٹ ثابت کرنے کے لئے کہا ہے" بادشاہ ہنسا اور کہنے لگا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا، صحیح پایا۔" پھر بادشاہ نے داستان گو کو سونے کی اشرفیوں سے مالا مال کر کے رخصت کر دیا۔

صرف چھے ہفتے

ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ان کا ایک دوست ملا جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ دو پولیس والے اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے وہ صاحب دوڑتے ہوئے اس کے قریب گئے اور بولے "ارے یہ کیا ہوا؟"

"میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے اور اب مجھے چھ ہفتے کے لئے جیل بھیجا جا رہا ہے....."

"بیوی کو قتل کرنے پر صرف چھ ہفتے کی جیل۔" وہ صاحب بڑبڑائے اور پھر بیوی کو پکارا "ادھر آؤ میں برسوں سے ایک بات پر غور کر رہا ہوں میں سوچتا ہوں اسے آج انجام دے ہی ڈالوں" یہ کہہ کر انہوں نے پولیس مین سے بندوق چھینی اور اپنی بیوی کو گولی مار دی۔

ان کے دوست نے بات پوری کرتے ہوئے کہا "میں چھ ہفتے جیل میں رہوں گا پھر مجھے پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔"

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

عبدالقادر

ساتھ رہتے تھے محبت سے کسی کوہسار میں
شیر، چیتا، بھیڑیا اور ایک گیدڑ غار میں

ایک دن یہ طے کیا کہ ہاتھ آئے جو شکار
اس کو بانٹیں گے برابر، ہم جو ہیں آپس میں یار

نکلے جوں ہی غار سے تو اک ہرن آیا نظر
شیر نے حملہ کیا تو وہ ہرن تھا خاک پر

تین ساتھی خوش ہوئے مل جائے گا حصہ ضرور
شیر کی نیت میں لیکن آگیا ایک دم فتور

چار حصے کر دیئے اور پھر لگائی اک دھاڑ
جس سے لرزا سارا جنگل اور تھرایا پہاڑ

بولا اک حصہ ہے میرا جیسا پایا ہے قرار
حق ہے میرا دوسرے پر، یہ ہے میرا ہی شکار

بادشاہ جنگل کا ہوں، میں آپ کا سردار ہوں
تیرے حصے کا میں ہی اس لئے حق دار ہوں

تین حصے اک طرف ہیں، ایک ہے ان سے پرے
جس میں ہمت ہے تو آکر وہ اسے حاصل کرے

شیر کی تقریر سن کر منہ ہی تکتے رہ گئے
کھا گیا وہ چار حصے، تینوں بھوکے رہ گئے

جنگلوں میں اور شہروں میں یہی ناسور ہے
جس کی لاٹھی بھینس اس کی، بس یہی دستور ہے

پانچ ایسے ملک یو۔ این۔ او۔ میں گویا شیر ہیں
جن کے اک ویٹو سے سارے فیصلے ہی ڈھیر ہیں

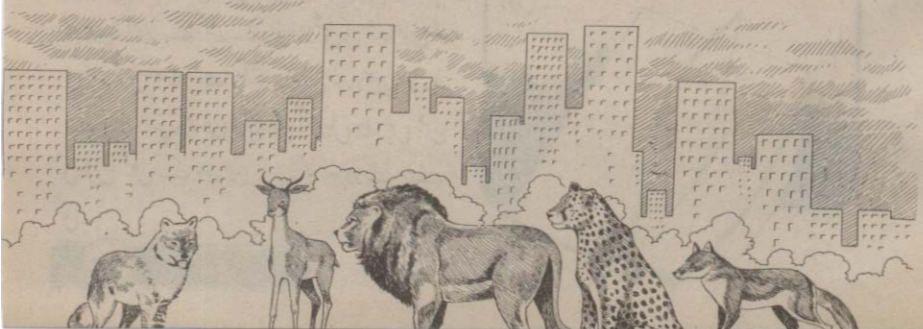

خوردبین بنائیے

م، الف، راشد

خوردبین ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے بہت چھوٹی چیزوں کو صاف، واضح اور بڑا کر کے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں عدسے استعمال ہوتے ہیں۔ عدسہ، مخصوص شکل کا شیشے کا ایک شفاف ٹکڑا ہوتا ہے جو اشیاء کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ سب سے پہلی خوردبین ایک جرمن تاجر نے بنائی تھی جو اُون کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے عدسہ کے طور پر شیشے کے ایک سادہ ٹکڑے کو استعمال کیا جو دھات کے ایک فریم میں جڑا ہوا تھا اور جسے فوکس کرنے کے لئے آسانی سے اوپر نیچے کیا جاسکتا تھا۔

آج ہم آپ کو ایک سادہ خوردبین بنانے کا طریقہ بتائیں گے جس کی مدد سے آپ اشیاء کو اتنا بڑا کر کے دیکھ سکتے ہیں جتنا کہ اس جرمن خوردبین سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ آپ اس میں عدسے کے طور پر شیشے کے ٹکڑے کے بجائے پانی کے قطرے استعمال کریں گے۔

دراصل عدسہ مکمل شکل کا ایک شفاف جسم ہوتا ہے جو اپنے اندر سے گزرنے والی روشنی کی شعاعوں کو موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خوردبین بنانے سے پہلے آپ کو ان اشیاء کی تفصیل بتا دیں جن کی اس عمل کے دوران آپ کو ضرورت پڑے گی۔

۱۔ تین عدد ٹین کے خالی ڈبے۔ (میجی بے بی کے چھوٹے ڈبے استعمال کئے جاسکتے ہیں)
۲۔ کٹر (قینچی)
۳۔ ایک کیل اور ہتھوڑا
۴۔ لکڑی کا ایک چھوٹا بلاک
۵۔ گریس یا کوکنگ آئل
۶۔ پنسل
۷۔ شفاف شیشے کا ایک چھوٹا ٹکڑا
۸۔ ایک چھوٹا آئینہ
۹۔ اسکواش ٹیپ
۱۰۔ بڑا بھائی یا باجی جو آپ کی ضروری مدد کر سکے۔

تو آیئے تصویروں کی مدد سے آپ کو خوردبین بنانے کا طریقہ بتایا جائے۔

۱۔ باجی یا بھیا سے کہئے کہ وہ ٹین کے ایک ڈبے سے تین سینٹی میٹر چوڑا اور دس سینٹی میٹر لمبا ایک ٹکڑا کٹر کی مدد سے کاٹ کر الگ کر دیں۔ پھر آپ اس کٹے ہوئے ٹکڑے کے کناروں پر چاروں طرف اسکواش ٹیپ چپکا دیجئے تاکہ آپ کے ہاتھ زخمی نہ ہوں۔

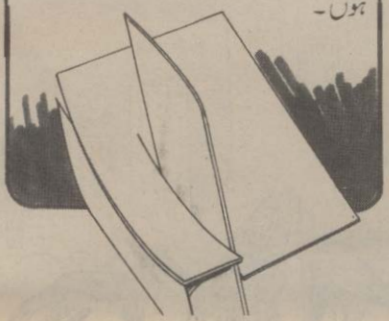

۲۔ ٹین کے کٹے ہوئے ٹکڑے کو لکڑی کے بلاک پر رکھیں اور کیل کی مدد سے بالکل درمیان میں دو ملی میٹر قطر کا سوراخ نکالیں۔ بہتر ہو گا کہ یہ کام بھی آپ بھیّا یا باجی سے کروالیں۔ کیل کو احتیاط سے سوراخ سے باہر نکالیں۔

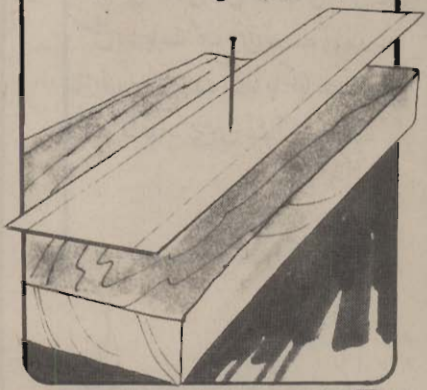

۳۔ ٹین کے ٹکڑے کو کناروں کی طرف سے اس انداز میں نیچے کی طرف موڑیں کہ وہ آسانی سے کھڑا رہ سکے۔ اب سوراخ کے آس پاس گریس یا کوکنگ آئل مل دیں۔

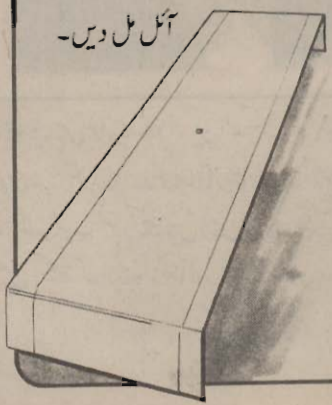

۴۔ باریک نوک والی پنسل کو پانی میں ڈبو کر ایک قطرہ ٹین کے سوراخ میں منتقل کریں۔

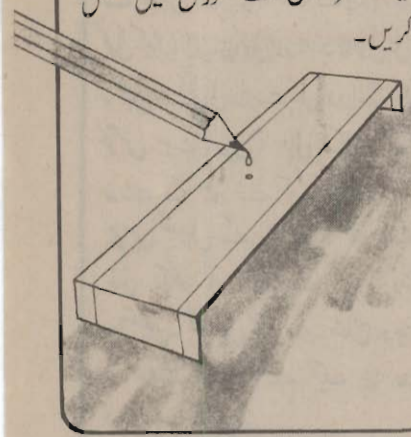

۵۔ ٹین کے باقی دو ڈبوں کو مناسب فاصلے سے کھڑا کریں اور ان کے اوپر شیشے کا شفاف ٹکڑا اس طرح رکھیں کہ وہ بالکل ہموار رہے۔ اس کے اوپر درمیان میں ٹین کے سوراخ والے ٹکڑے کو رکھیں اور بالکل نیچے آئینے کو لکڑی کے بلاک کے سہارے اس زوایئے سے کھڑا کریں کہ اس سے منعکس ہونے والی روشنی براہِ راست شیشے اور پانی کے قطرے پر پڑے۔

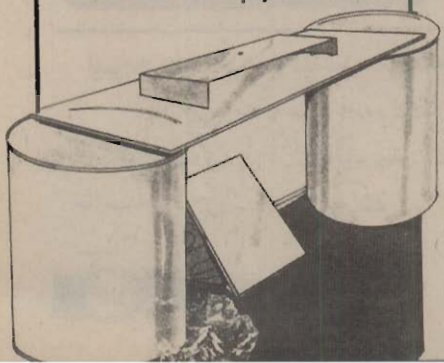

۶۔ لیجئے خوردبین تیار ہے۔ ٹین کے ٹکڑے کے سوراخ کے نیچے، نمک کے چند ذرے، کوئی کیڑا یا ایسی ہی کوئی اور بہت چھوٹی سی چیز رکھیں اور انگلی کی مدد سے ٹین کو دباتے ہوئے فوکس سیٹ کریں۔ پانی کے اس ننھے عدسے کے اندر سے آپ بہت سی ایسی چیزیں تفصیل کے ساتھ دیکھ سکیں گے جو خالی آنکھ کی مدد سے نہیں دیکھی جاسکتیں۔ اگر پانی کا یہ عدسہ ضائع ہو جائے تو سابقہ طریقے سے ایک نیا عدسہ فوراً بنایا جاسکتا ہے۔

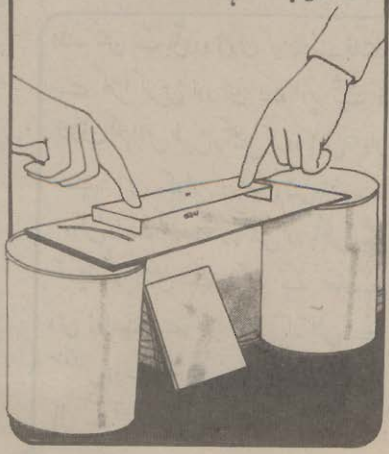

خوردبین بنانے کا ایک اور آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک پیپر کلپ کو سیدھا کریں اور اس کے ایک سرے کو موڑ کر سوراخ سا بنالیں۔ اس سوراخ پر گریس مل کر اسے پانی میں ڈبوئیں گے تو پانی کا ایک قطرہ اس سوراخ میں عدسے کی شکل میں معلق ہو جائے گا۔ اس عدسے کی مدد سے چیزوں کو بڑا کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ خیال رکھئے کہ عدسہ چیزوں کے قریب تر ہو۔

ایک مرتبہ مرزا غالب نے اپنے روزہ داری کے ثبوت میں نواب علاؤ الدین احمد خان کو ایک خط لکھا۔

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھ لیتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی روٹی کا ٹکڑا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ نہیں رکھتے! یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور بہلانا اور بات ہے۔"

ناقابلِ یقین

ناقابلِ یقین
ناقابل یقین

عظمیٰ سلطانہ

بد قسمت ہوائی جہاز

آیئے اب ہم آپ کو ایک ہوائی جہاز کی بدقسمتی کی کہانی سناتے ہیں۔ مسافر بردار طیارے -AH EM-4 کی بدقسمتی کا آغاز جولائی ۱۹۴۵ء سے ہوا جب ایک میکینک جہاز پر سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ ایک سال بعد ۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو جہاز کا کپتان پرواز کے دوران فوت ہو گیا۔ ایک سال بعد ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو

پرواز کے دوران جہاز میں آگ لگ گئی جبکہ ۱۹۴۸ء بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے گزر گیا لیکن ۱۰ جولائی ۱۹۴۹ء میں یہ جہاز شکاگو کے قریب گر کر تباہ ہو گیا نیز تمام مسافر بھی ہلاک ہو گئے۔

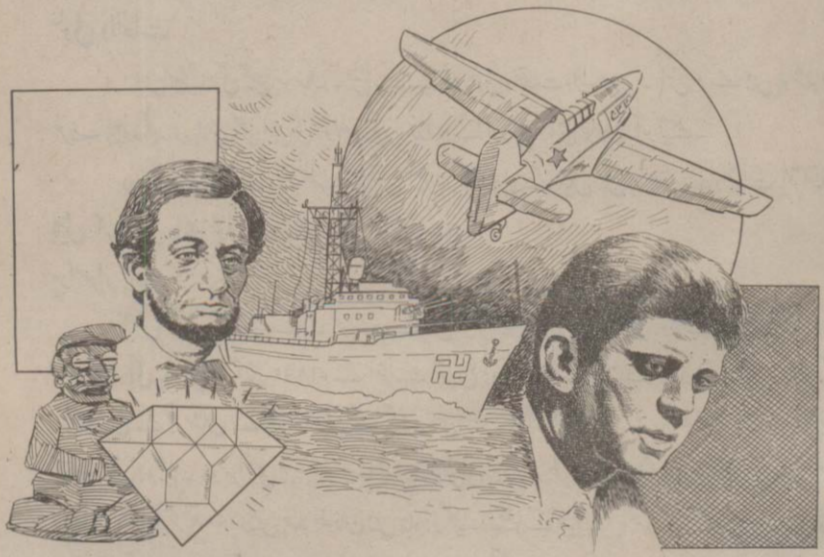

ایسے مکان اور گاڑیاں بھی موجود ہیں جو اپنے مالک کے لئے تباہی کا باعث بنے۔ -ARCDUKE

FERDINAND نے ایک گاڑی خریدی جولائی ۱۹۱۴ء میں اسے اور اسکی بیوی کو قتل کر دیا گیا اسکے بعد یہ گاڑی آسٹرین آرمی کے ایک جنرل نے خریدی کچھ مہینوں کے بعد جنگ عظیم اوّل میں جنرل کو شکست ہوئی اور اسی صدمے میں اسکا انتقال ہو گیا گاڑی کے دوسرے مالک نے گاڑی خریدنے کے صرف ۹ دن بعد بہت زبردست حادثے کے نتیجے میں ۲ افراد کو ہلاک کر دیا جنگ ختم ہونے کے بعد یہ گاڑی یوگوسلاویہ کے گورنر کی ملکیت میں آئی چار مہینے میں گاڑی کے چار حادثات میں اپنا ایک ہاتھ کھونے کے بعد انہوں نے یہ گاڑی ایک ڈاکٹر کو بیچ دی جو اس گاڑی کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا پھر یہ گاڑی ایک جوہری اور پھر ایک ڈاکٹر نے خریدی دونوں ہی گاڑی کے حادثے میں مارے گئے بالآخر یہ گاڑی ویانا میوزیم میں رکھ دی گئی

موت کا ہیرا

مشہور نیلا ہیرا جس کا نام HOPE DIAMOND ہے آج کل SMITHSONIAN INSTITUTE واشنگٹن میں محفوظ ہے۔

خونی واقعات

اس ہیرے کی تین سو سالہ تاریخ سے بے شمار خونی واقعات وابستہ ہیں۔ اس عرصے میں بادشاہ اور غریب، چور اور درباری بھی اس کی خوبصورتی پر فدا ہوئے اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے۔

وہ لوگ جو نحوست کے نظریہ پر یقین نہیں رکھتے ان کے خیال میں بدقسمتی کے واقعات یا تو اتفاقیہ پیش آتے ہیں یا پھر خوف اور ذہنی انتشار کے باعث۔

پراسرار جہاز

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نحوست کے اس کھیل میں روحوں کا دخل ہوتا ہے مثلاً جہاز HIN-EMOA کی بدقسمتی کا آغاز ۱۸۹۲ء کے سفر سے شروع ہوتا ہے جب جہاز کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے لندن کے قبرستان کے پتھر استعمال کئے گئے۔ اس سفر کے دوران عملے کے چار افراد مر گئے۔ اسکا پہلا کپتان پاگل ہو گیا۔ دوسرا کسی جرم اور تیسرا شراب نوشی کی بناء پر برطرف کر دیا گیا اور چوتھا اپنے کیبن میں مرا ہوا پایا گیا بالآخر ۱۹۰۸ء میں جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا۔ عملے کے خیال میں جہاز کے منحوس ہونے کی وجہ یہ تھی کہ قبرستان کے پتھروں میں مردوں کی ہڈیاں موجود تھیں۔

اسی طرح GREATEASTERN نامی ایک جہاز کی تاریخ بھی بدقسمتی سے عبارت ہے لوگوں کے خیال میں یہ جہاز اس لئے منحوس تھا کہ تعمیر کے دوران دو مزدور اسکی دیوار میں قید ہو کر ہلاک ہو گئے

صدر کی بدقسمتی

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ۱۸۴۰ء کے بعد ہر وہ امریکی صدر جو ایسے سال منتخب ہوا جو ۲۰ سے تقسیم ہو جائے اپنے عہدے کے دوران فوت ہو گیا ان میں سے تین اپنی طبعی موت مرے۔

ولیم ہنری ہیریسن جو ۱۸۴۰ء میں منتخب ہوئے، وارن جی (۱۹۲۰ء) اور فرینکلن جی اور ویلٹ (۱۹۴۰ء) جبکہ ابراہام لنکن (۱۸۶۰ء) اور جان ایف کینیڈی (۱۹۶۰) میں منتخب ہوئے اور انہیں قتل کیا گیا۔

کوئی بھی آج تک یہ نہ جان سکا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟۔ لیکن اکثر ممالک میں کسی شخص کی بدنصیبی کی وجہ "نظر بد" مانی جاتی ہے یعنی کچھ افراد ایسی قوت رکھتے ہیں کہ محض ان کی ایک نظر دوسروں کی مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔

آیئے ہم آپ کو ایسی سچی کہانیاں سنائیں جو ایسے جہازوں، جواہرات، گاڑیوں اور گھروں سے متعلق ہیں، جو لوگوں کے لئے بدقسمتی کا باعث بنے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر آپ کا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ وہ کیا وجوہات ہوتی ہیں جن سے کچھ چیزیں، لوگوں کی بدقسمتی کا پیغام لاتی ہیں؟۔ وہ کیوں منحوس سمجھی جاتی ہیں؟۔ اور یہ کہ ان کے نحوست کس طرح کام کرتی ہے؟

خوش قسمتی کا مجسمہ؟۔

یہ ۱۹۲۸ کی بات ہے، جب ایک انگریز سی جے لیمبرٹ اور ان کی بیوی میری بحری سفر کے ذریعہ جاپان پہنچے اور وہاں سے شہر کوب (KOBE)، کی ایک پرانی دکان سے ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مجسمہ خریدا۔ میری نے جلد ہی اس مجسمہ کو پہچان لیا، یہ جاپانیوں کا خوش قسمتی کا دیوتا ہوتی تھا۔ یہ مجسمہ بہت خوبصورتی سے تراشا گیا تھا لیکن مجسمے کے نچلے حصے میں چھوٹا سا ایک سوراخ تھا۔ لیمبرٹس اس مجسمے کی موجودگی کو اپنے لئے خوش قسمتی تصور کر رہا تھا۔ ہوٹی دراصل چھٹی صدی میں بدھ مت کا ایک درویش تھا، جس نے اپنی زندگی غریبوں خصوصاً بچوں کی مدد میں گزاری۔ دورانِ سفر اس مجسمے کی موجودگی میں دونوں کو دانت میں تکلیف کا مرض لاحق رہا۔ لیکن ساحل پر پہنچنے کے بعد جب وہ اپنے جہاز کے کیبن سے باہر جاتے یا ڈاکٹر کے پاس جاتے تو یہ درد ٹھیک ہو جاتا مگر واپس آنے پر درد دوبارہ شروع ہو جاتا۔ امریکہ پہنچنے پر لیمبرٹ نے یہ مجسمہ اپنی ماں کو تحفے کے طور پر دیا۔ لیکن یہ کیا؟۔ اسکی ماں کے بہترین دانتوں میں بھی درد شروع ہو گیا۔ اور انہوں نے یہ تحفہ واپس کر دیا۔ پھر لیمبرٹ نے یہ مجسمہ اپنے جہاز میں موجود ایک

خاتون کو دیا۔ جب یہ خاتون اس مجسّمے کو اپنے شوہر کو دکھانے لے گئی تو ان دونوں کے دانت میں بھی درد شروع ہو گیا اور یوں یہ مجسمہ لیمبرٹ کے پاس واپس آ گیا۔ اب لیمبرٹ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید یہ مجسمہ ان کے دانت کے درد کا باعث بنا ہوا ہے۔ میری اس مجسّمے کو سمندر میں پھینکنا چاہتی تھی مگر اس کے شوہر کا خیال یہ تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو مجسّمے کے اوپر سطح سمندر پر موجود ہر انسان دانت کے درد میں مبتلا ہو جائے گا، لہٰذا وہ اسے دوبارہ جاپان لے گئے۔ جہاں انہوں ایک قدیم ساز و سامان رکھنے والی دکان کے مالک کو اپنے ساتھ پیش آنے والی روداد سنائی۔ مالک نے لیمبرٹ کو ایک عبادت گاہ میں بھیجا جہاں موجود دو اشخاص نے اس بجسّمے کو دیکھ کر بتایا کہ یہ ایک عبادت گاہ کا مجسمہ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مجسّمے کے نچلے حصے میں موجود اس سوراخ کے ذریعے اس میں "روح" ڈالی گئی تھی۔ اس مجسّمے کو عبادت گاہ میں احترام سے رکھنے کے بعد انہوں نے لیمبرٹ کو بہت غصے سے دیکھا اور وہاں سے جانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد لیمبرٹ نے اس جگہ کا دوبارہ رخ نہ کیا۔ لیمبرٹ نے پورے واقعے سے یہ اندازہ لگایا کہ اس دیوتا نے ناراض ہو کر اس طرح بدلہ لیا۔ لیکن اس نظریہ سے اختلاف رکھنے والوں کا خیال یہ ہے کہ بدقسمتی کا یہ کھیل دراصل خود لوگوں کے اپنے رویوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو لاشعوری طور پر اپنے لئے تباہی لاتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی کام یا چیز کے بارے میں ہمیشہ یہ تصور کرتے ہیں کہ کوئی بُرا واقعہ پیش آنے والا ہے۔

منحوس جنگی جہاز :۔

منحوسیت نہ صرف انسانوں بلکہ چیزوں کے ساتھ بھی وابستہ کی جاتی ہے۔ ۲۶ ہزار ٹن وزنی جرمن جنگی جہاز (SCHARNHORST) بھی ایک ایسا ہی جہاز تھا۔ یہ جہاز اکتوبر 1936 میں بن کر تیار ہوا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب یہ زیر تعمیر تھا ہوا یوں کہ اپنی تعمیر کے دوران میں یہ جہاز پھسل کر سمندر میں چلا گیا اور ساٹھ مزدور کچل کر ہلاک اور ایک سو زخمی ہو گئے۔ جہاز کے منحوس ہونے کے خیال کو مستحکم کرنے والا دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جس دن ہٹلر کو اس کا افتتاح کرنا تھا اس سے ایک روز پہلے جہاز خود ہی سمندر میں اتر گیا اور کئی کشتیوں کو تباہ کر دیا اسکے بعد جہاز نے اپنی بدقسمتی کے کئی دن دیکھے اور بالآخر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء میں جنگ کے دوران ایک انگلستانی جہاز کی گولہ باری سے تباہ ہو گیا جہاز کے عملے کے ۱۹۰۰ افراد میں سے صرف ۳۶ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔

بادام

سیّد احسن اعجاز

جس میں دماغی طاقت کا راز ہے!

بادام مفید اور مزیدار میوہ ہے۔ اسکی گریاں ذائقے دار اور صحت کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ بادام کا درخت تقریباً آٹھ یا دس فٹ لمبا ہوتا ہے۔ کھال سرخی مائل ہوتی ہے۔ اور پتے لمبے، کھال کے ساتھ جڑے ہوئے، درمیان سے چوڑے اور آگے پیچھے سے پتلے ہوتے ہیں پتوں کا رنگ ہلکا سبز ہوتا ہے۔ جو بعد میں پتے کے پکنے پر سفید ہو جاتا ہے۔ اسکے پھول سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ جن پر سرخ رنگ کی چھینٹیں سی پڑی ہوتی ہیں۔ ہر ایک پھول میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ جو دیکھنے میں بڑی خوش نما لگتی ہیں۔ جب درخت پر پھول آئے ہوئے ہوں تو یہ بڑا خوش نما دکھاؤ دیتا ہے۔

ذائقے کے لحاظ سے بادام کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کا بادام کڑوا اور دوسری قسم کا میٹھا ہوتا ہے۔ کڑوا بادام منہ کا ذائقہ خراب کر دیتا ہے اس لئے میٹھا بادام ہی کھانے کے کام آتا ہے۔ حجم کے لحاظ سے بھی بادام کی مختلف قسمیں ہیں۔ جن میں کاغذی بادام اور کاٹھا، کھٹا یا ٹھڑا بادام ہیں۔ کاغذی بادام حجم میں نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے اسکا چھلکا پتلا اور نرم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس کاٹھے یا ٹھڑے بادام کا چھلکا سخت اور موٹا ہوتا ہے اور آسانی سے نہیں ٹوٹتا۔

بادام کی گری میں پروٹین، وٹامنز، نمکیات، نشاستہ، روغن، شکر، گوند اور معدنیاتی اجزاء وافر ملتے ہیں۔ کڑوا بادام نہیں کھانا چاہئے۔ کیونکہ اس میں ایک قسم کا زہر "ہائڈروسینک ایسڈ" پایا جاتا ہے جس کی بہت تھوڑی مقدار بھی انسان کو فوراً موت کے منہ میں دھکیل دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہ زہر فوری اثر کرتا ہے۔ اور علاج کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس لئے کڑوا بادام ہر گز نہیں کھانا چاہئے۔ ویسے بھی یہ بہت بدمزہ ہوتا ہے۔ بادام بہت پرانا میوہ ہے۔ پرانے زمانے کے مصری اور یونانی صحیفوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں بادام صرف امیر لوگ اور بادشاہ ہی کھاتے تھے۔ اور غریب اس میوے سے محروم تھے۔ غریب اور عام لوگ اس کے ذائقے تک سے ناواقف تھے۔ اس زمانہ میں بادام "شاہی میوہ" کہلاتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے یوم پیدائش سے صدیوں پہلے سے اطالوی اور یونانی باشندے بادام کے تیل اور بیج کے

استعمال کے متعلق جانتے تھے۔ پرانے زمانے میں بادام مقدس میوہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور دیوتاؤں سے برکت اور رحمت حاصل کرنے کے لے لوگ اسے مذہبی تہواروں پر استعمال کرتے تھے۔ رومااور یونان کے پرانے حکیم بادام کی گریوں سے نکلنے والے تیل سے مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ یونان کے ممتاز طبیب "شافرسطس" نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں میں بادام کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ عراق کے آثار قدیمہ کے ماہرین کو سات ہزار برس پرانے ایک شہر کی کھدائی کے دوران ایک صندوق ملا جب اسے کھولا گیا تو اس میں سے بادام ملے، جن کا چھلکا اور گریاں بالکل محفوظ ہیں۔ تجزیہ کے بعد پتہ چلا کہ ان باداموں کی عمر ساٹھ ہزار سال ہے۔ انکے ذائقے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر روغن خشک ہوچکا ہے۔ یہ بادام عراق کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ بادام کا اصل وطن بحیرہ روم کا ساحلی علاقہ ہے۔ اور کچھ ماہرین کے خیال کے مطابق بادام کا اصل وطن ایران ہے۔ بادام اٹلی، امریکہ، پرتگال، جنوب مغربی ایشیاء، افغانستان اور مراکش میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

بادام خاص طور پر دماغی بیماریوں میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ بادام دماغی طاقت کے لئے بہت مفید ہے۔ مغلیہ دور کا بادشاہ اکبر بہت ذہین تھا۔ اس کی ذہانت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ روزانہ باقاعدگی کے ساتھ بادام استعمال کرتا تھا۔ حکماء بادام سے ان گنت بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ حافظے کی خرابی، عام جسمانی کمزوری نظر کی کمزوری میں بادام استعمال کرنا بہت مفید ہے۔

اس کے علاوہ آنتوں کے زخموں کے لئے انتہائی مؤثر ہے۔

آنتوں کی بیماریوں کے علاج میں بھی بادام استعمال کیا جاتا ہے۔ بادام کے چھلکوں سے بہترین منجن تیار کیا جاتا ہے۔ جو دانتوں کی تمام بیماریوں کے علاج میں بے حد مفید ہے۔ کبھی کبھار چکر آنے کے ساتھ سر درد بھی شروع ہو جاتا ہے، دماغی کام اور لکھنے پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی، ایسی حالت میں صبح سویرے دس بارہ بادام ایک تولہ مصری کے ساتھ ملا کر ایک ہفتہ تک کھانے سے ان علامات میں نمایاں فرق آجاتا ہے۔ عام حالت میں میٹھے بادام روزانہ بیس عدد کھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن مختلف بیماریوں کی حالت میں بادام کھانے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ اگر روغن بادام استعمال کرنا ہو تو اس کی مقدار آدھا تولہ سے ڈیڑھ تولہ تک ہے جسم کو موٹا کرنے اور طاقتور کرنے کے لئے بھی بادام مفید ہیں۔

بادام کی گریوں کے پھوک سے ابٹن تیار کیا جاتا ہے۔ جس کے چہرے اور جسم پر استعمال سے جلد ملائم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ داغ اور جھریاں غائب ہو جاتی ہیں۔ اور چہرہ نکھر آتا ہے۔ بادام کی گریاں مٹھائیوں اور کھانوں میں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ طاقت دینے والی عام دواؤں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اور خاص طور پر اسکول جانے والے بچوں کے لئے بہت ہی مفید ہیں۔ مختلف زبانوں میں

بادام کے مختلف نام ہیں۔ اردو، بنگالی، ہندی اور فارسی میں اسے "بادام" پنجابی اور گجراتی میں "انڈوڈم"، انگریزی میں "آمنڈ"، یونانی میں "ایمگ ڈبلیا"، لاطینی میں "ایمگ ڈیلس کامونس" تلوگو میں "بیدم" اور عربی میں "لوز" کہتے ہیں۔

کیسی رہی؟

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

* ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
* ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
* ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

* ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
* ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے سبزیاں شوق سے کھائیے ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

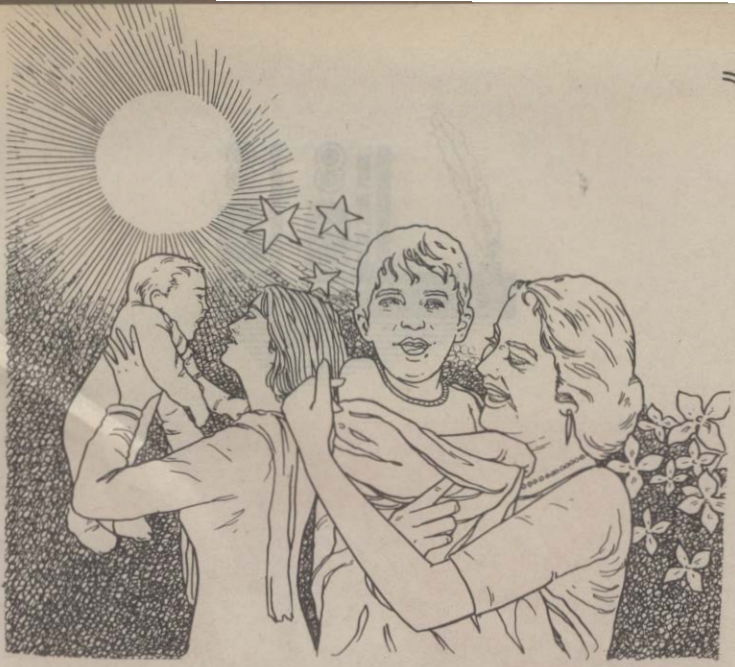

ماں

غلام عباس طاہر

ماں ہے اللہ کی اک نعمت
بچو! ماں کی بڑی ہے برکت

ساری دنیا جانے بچو
ماں کے قدموں میں ہے جنت

جو نہ مانے ماں کا کہنا
اس کو سمجھو تم بد قسمت

خوش قسمت ہے ہر وہ بچہ
حاصل جس کو ماں کی شفقت

جتنی بھی بن پائے تم سے
کر لو طاہر ماں کی خدمت

کاش

عنبرین عشرت (نامعلوم)

یکایک آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ ہم نے کروٹ بدلی مگر بند آنکھوں پر روشنی کی کرنیں پڑتی محسوس ہوئیں تو بے چین ہو کر اٹھے۔ صحن کا بلب جلتا نظر آیا گھڑی پر نظر ڈالی تو پانچ بج رہے تھے۔ "گیارہ بجے اٹھنے والے پانچ بجے اٹھ گئے۔" ہم نے حیرانگی سے سوچا۔ چلو چل کر معلوم کریں آخر کیا ماجرا ہے۔ چپل کی تلاش میں کمرے میں نظر دوڑائی تو حیرانگی کا کرنٹ لگا۔ ہمارا کمرہ (جسے ہم کمرہ کم اور کباڑیئے کی دکان زیادہ سمجھتے تھے) آئینے کی طرح چمکا ہوا تھا۔ "یہ تم اتنی سلیقہ مند کب سے ہو گئیں۔" ہم نے خود سے سوال کیا شاید نیند میں کام کرنے کی بیماری ہو گئی ہے۔ باجی کی تلاش میں باورچی خانے کا رخ کیا تو وہاں امی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیں یاد آیا کہ امی جان تو کل لاہور چلی گئیں تھیں۔ "ہائیں امی آپ کب آئیں۔" امی تو ابھی واپس نہیں آئی تھیں۔ جنہیں ہم نے امی جانا تھا وہ ہماری باجی تھیں۔ ہماری حیرانگی بجا تھی کیونکہ باجی گھر میں دوپٹہ تک نہیں پہنتی تھیں مگر آج امی کی طرح چادر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی۔ "جاؤ میں نے نماز پڑھ لی ہے تم بھی پڑھ لو۔" "کیا آپ اور نماز۔" ہم حیرت سے چیخے۔ "یااللہ یہ کیا ماجرا ہے۔" اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری باجی ماہین نت نئے فیشن کی شوقین تھیں اور دوپٹے کو گلے میں پٹی کی طرح لٹکانا بھی فیشن ہے۔ یہ تھا ہماری حیرانگی کا سبب۔ غسل خانے کا دروازہ بند تھا۔ بھیا اندر تھے۔ مگر اتنی صبح؟ آج کل کالج کی چھٹیاں تھیں وہ گیارہ بجے اٹھتے اور بارہ بجے ناشتہ کرتے۔

ہم صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے "صبح بخیر۔" بھیا نے کہا۔ ہم ان کا حلیہ دیکھنے

میں مصروف ہوگئے۔ "کیا مائیکل جیکسن سوٹ چوہے کھا گئے بھیّا؟" ہمارا اشارہ ان کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کی طرف تھا۔ "نہیں بہنا ہمیں پاکستانی سوٹ پہننا چاہئے۔" "اوہ مائی گاڈ۔" "بہنا اردو بولو۔" یہ ہمارے وہ بھیا تھے جنہیں انگلش سے اتنا پیار تھا کہ انگلش امریکن سینٹر میں سیکھی تھی۔ "میں پاگل ہو جاؤں گی۔" ہم دھیرے سے بڑبڑائے۔ بھیا نے باجی کو آواز دی جلد ہی پانی کا گلاس آگیا۔ "چلو تیاری کرو اسکول نہیں جانا کیا؟" باجی نے کہا۔ ہم جلدی سے غسل خانے گئے اور پونے سات بجے ہم بالکل تیار تھے۔ چادر کاندھوں پر پھیلائی اور باہر کارخ کیا باجی نے آگے بڑھ کر چادر سے ہمارا سر ڈھانپا۔ اب تو ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ باجی اور بھیا تھوڑے ہی نہیں بلکہ زیادہ کھسک گئے ہیں۔ گلی پار کرنے تک ہم ان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ہماری مخالف سمت سے پانچ لڑکوں کا گروپ آرہا تھا۔ ہائیں یہ کیا سبحان اللہ سر کو تو ٹوپیوں میں چھپا رکھا ہے۔ نگاہیں جھکائے یوں چلے آرہے تھے کہ گویا بارِ گناہ سر نہ اٹھانے دے رہا ہو۔ ہائیں یہ تو شرمیلی دوشیزاؤں کی طرح سمٹ کر چلے گئے بغیر کسی بے ہودہ فقرے کے۔ چلو شکر ہے مولا کا کہ نئی نسل کو عقل تو آئی۔ ہم نے سوچا شاید امریکہ نے کوئی نیکی کا بم تیار کر کے تجربتہً پاکستان میں پھینک دیا ہے مگر امریکہ ایسی غلطی نہیں کر سکتا وہ ہتھیار تو بنا سکتا ہے لیکن امن کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اسکول پہنچے تو اسکول کا حلیہ مختلف تھا۔ ہمیشہ سے زیادہ صفائی تھی۔ سارا دن طالب علموں نے نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ ہماری حیرت اس وقت مزید بڑھ گئی جب ہم نے اپنی دوست کا کاندھا ہلا کر سرگوشی کی مگر اس نے بات نہ کی ہم سدا کے ڈھیٹ تھے۔ اسے دوبارہ ہلایا۔ جھلا کر اس نے ٹیچر سے شکایت کر دی انھوں نے ہمیں شفقت سے سمجھایا۔ ہماری یہ ٹیچر ملک الموت کی بہن اور سخت گیری میں ہٹلر کی چچی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر گھر آئے۔ گھر آکر نیند کیا آنی تھی کروٹیں بدلتے شام ہوگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو سورج نے مشرق سے دیدار کروایا مگر یہ کیا ہم نے آئینے کی مانند کمرے کو اپنی سابقہ کباڑیئے کی دکان بنا پایا۔ باہر کارخ کیا تو پھٹے ہوئے قالین میں الجھ کر گر پڑے۔ بھیا نے کمرے میں جھانکا ہم ان کے مائیکل جیکسن سوٹ کی جھلک دیکھ چکے تھے۔ بہنا مجھے صائمہ کے گھر جانا ہے۔ یہ سوٹ ویسا ہی بنا ہے نا جو طارق روڈ پر دیکھا تھا ماہین باجی نے کہا۔ ہم..... ہم نے آنکھیں بند کرلیں بھئی نہیں بتانا تو نہ بتاؤ مبشرات کو آئے گا اور دو بجے تک تم گھر کی صفائی کر لینا۔ ماہین باجی ہمیں سوچوں کے صحرا میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ مانا کہ ہم اپنے خواب میں بہت حیران تھے مگر بیداری میں وہ بہت دلکش لگا۔ ہمارے دل میں خواہش اٹھی کہ کاش میرا خواب حقیقت بن جائے کاش..... کاش.....

مسلمان سائنسدان

مرتبہ: خاور رحمان

آج کے موجودہ دور کو سائنسی دور کہنا بالکل درست ہے۔ لیکن سائنسی ترقی میں اہل یورپ اور یونانی حکماء جس طرح بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ جس زمانے سے اہل یورپ سائنسی ترقی کا دعوی کرتے ہیں اس سے بہت پہلے ہی مسلمان سائنس دانوں نے اس ضمن میں بے شمار کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی کا وہ زمانہ جب یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا نہ تو کوئی یورپی فلسفی تھا اور نہ سائنس داں۔ اس دور میں اسلام ہی کی روشنی تھی جو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

اس زمانے کے مشہور مسلمان سائنس دان

۱۔ عباس بن فرناس:۔ اندلس (اسپین) کا سائنس داں جس نے ۸۶۱ء میں مصنوعی پر لگا کر شہر

قرطبہ پر پرواز کی اور اس کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

۲۔ شریف ادریسی:۔ عرب جغرافیہ دان اس نے آٹھ سو سال قبل دنیا کا پہلا نقشہ بنایا موجودہ نقشے اسی نقشے کی نقل ہیں۔ جغرافیے پر پہلی کتاب بھی اسی نے لکھی تھی۔ جو تین سو سال تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہی۔

۳۔ جابر بن حیان:۔ اس نے سب سے پہلے تین تیزابوں کی دریافت کی جو کہ شورہ کا تیزاب، گندھک کا تیزاب، ایکوا رسجیا ہیں۔ یہ تیزاب اس نے ایک ہزار سال قبل اپنے ایک آلے "قرع النبیق" سے تیار کئے تھے۔

۴۔ ابن الہیثیم:۔ عرب طبیب اس نے ۹۰۰ سال پہلے آنکھ کا خاکہ بنایا اور بصریات پر دنیا کی پہلی کتاب "کتاب المناظر" لکھی یورپ کے سائنس دانوں نے اسی کتاب کی مدد سے کیمرا ایجاد کیا۔

۵۔ ابن البیطار:۔ اندلس کا طبیب اس نے تقریباً ۸۰۰ سال پہلے دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ اور ان کی خاصیتوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب تھی۔

۶۔ ابن سینا:۔ عرب طبیب اس نے ۹۰۰ سال پہلے ان بیماریوں کا علاج معلوم کیا جو پہلے ناقابل علاج تھیں۔ اس کی کتاب "القانون فی الطب" ۵۰۰ سال تک یورپ کے میڈیکل کالجوں میں پڑھائی جاتی رہی۔

۷۔ علی ابن الطبری:۔ آپ طب، فلسفہ، زولوجی، سائیکالوجی اور ایسٹرانومی کے ماہر تھے۔ طبرستان میں ۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۸۷۰ء میں وفات پائی۔

۸۔ ابوالقاسم مجریطی:۔ آپ نے جانوروں کے علم پر اہم کام سرانجام دیا آپ کی مشہور کتاب جانوروں کی نسل اہل یورپ میں کافی عرصے تک بہت مقبول رہی۔

ان سب کے علاوہ ابو ہاشم خالد، عبدالمالک اسمعی، محمد بن زکریا رازی، ابن زہر، ابو داؤد، سلیمان بن جان اور ابوالقاسم الزھروی مشہور مسلمان سائنسدان تھے۔

مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کا یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے جس سے مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات کا با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چودھویں صدی کے بعد مسلمانوں کی کوتاہیوں اور لاپرواہیوں کی وجہ سے یہ سائنسی خزانہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یورپی اہل علم مسلمانوں کی سائنسی تحقیقات کا مطالعہ کرنے میں لگ گئے اور اس مطالعے کی وجہ سے ان میں سائنس کا شوق بڑھتا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو سات سو سال سے اہل علم کے رہنما مانے جاتے تھے ان کی جگہ یورپی سائنس دانوں نے لے لی اور مسلمانوں کا دور ختم ہو کر مغربی دور شروع ہوا جو تا حال جاری ہے۔

چالاک منشی

جمیل الدین، کراچی

سلمان اور علی رضا دو بھائی تھے۔ سلمان بڑا تھا اور سمجھ دار بھی تھا۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ وہ تجارت کی غرض سے دوسرے ممالک جایا کرتے تھے۔ اگر ایک سال علی رضا تجارت کیلئے جاتا تو سلمان گھر پر رہتا۔ اور سلمان جاتا تو علی رضا گھر پر رہتا تھا۔

ایک دفعہ سلمان تجارت کیلئے بحری سفر طے کر رہا تھا کہ سمندر میں اچانک طوفان آگیا اور چند لمحوں میں جہاز سمندر میں غرق ہو گیا۔ بیشتر لوگ زندہ بچ گئے تھے اور مزید زندگی کیلئے جدوجہد کر رہے تھے۔ سلمان بھی بہت مشکل سے جان بچا کر تیرتا تیرتا کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کا سارا تجارتی سامان جہاز سمیت سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ اب سلمان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا جس کے ذریعے وہ واپس گھر روانہ ہوتا۔ سلمان نے سوچا کہ اگر "مجھ کو اس قصبے کی کوئی بڑی دکان والا قرض دے دے تو میں تجارت کر کے منافع رکھ کر اس دکاندار کی رقم اس کو واپس ادا کر دوں گا۔" یہ خیال آتے ہی سلمان نے بڑی دکان کی تلاش شروع کر دی اور جلد ہی وہ ایک بڑی دکان کے مالک کے پاس کھڑا تھا۔ سلمان نے اپنی آپ بیتی کہہ سنائی اور قرض کے طور پر کچھ رقم مانگی۔ دکان کا مالک ایک رحمدل آدمی تھا۔ اس نے منشی کو کہا کہ "وہ اس آدمی کو ادھار رقم دے دے۔" منشی ایک چالاک اور تجربہ کار آدمی تھا اس نے سلمان کے سچ کو تولنے کیلئے کہا کہ "آپ رقم کے بدلے کوئی چیز رکھ جائیں اور واپسی پر رقم دے کر اپنی چیز لے لیجئے گا۔" سلمان کے پاس کچھ ہوتا تو دیتا۔ سلمان نے کہا کہ "اس رقم کے بدلے میری مونچھ کا بال رکھ لو۔" اور مونچھ کا ایک بال توڑ کر دے دیا۔ منشی نے کہا کہ "یہ بال تو مڑا ہوا ہے۔" سلمان نے کہا کہ "جیسا بھی بال ہے میرا ہے۔" منشی نے ادھار رقم دے دی اور بال کو

رکھ لیا۔

سلمان نے تجارت سے واپسی پر منشی کو رقم واپس کردی اور بال واپس لے لیا۔ اور گھر پہنچ کر اپنے بھائی علی رضا کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اب چونکہ علی رضا کو تجارت کیلئے جانا تھا اس لئے اس کے دل میں لالچ سما گئی وہ تجارت کو روانہ ہوا اور اسی قصبے میں پہنچ کر علی رضا نے فقیروں جیسی اپنی حالت بنائی اور اس دکان میں جاکر کہا کہ "میرا جہاز سمندر میں ڈوب گیا ہے جس میں میرا سارا تجارت کا سامان موجود تھا اگر آپ مجھے کچھ رقم قرض عنایت فرمائیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اور جلد واپس کردوں گا۔" دکان کے مالک نے رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منشی کو کہا کہ وہ اس آدمی کو قرض دے دے۔ منشی نے اپنی عادت کے مطابق کہا کہ "رقم کے بدلے کوئی چیز گروی رکھ جائیں۔" علی رضا کو اس وقت کا ہی انتظار تھا اور اس نے جھٹ سے اپنا مونچھ کا بال توڑ کر آگے کر دیا مگر منشی نے کہا کہ "یہ تو مڑا ہوا ہے۔" علی رضا نے دوسرا بال توڑ دیا مگر منشی نے کہا کہ یہ بھی مڑا ہوا ہے۔ اسی طرح علی رضا جب چار بال توڑ چکا تو منشی نے کہا کہ "بھائی تم بالکل جھوٹے ہو اور لالچی ہو۔ اگر تم سچے ہوتے سو مڑا ہوا بال ہی رکھوا کر رقم ادھار لے سکتے تھے مگر تم پر لالچ کا بھوت سوار تھا۔ لہٰذا یہاں سے خاموشی سے چلے جاؤ اور کبھی لالچ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔

جواہر پارے

مرسلہ: ذیشان یوسفانی، میرپورخاص

(۱) بہترین خدمت کرنے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔

(۲) جس نے دشمن نہیں بنایا وہ دوست بھی نہیں بنا سکتا۔

(۳) کسی کام میں تاخیر کرنا دل میں جلنے والے چراغ کی روشنی کو ضائع کرنا ہے۔

(۴) پڑے پڑے زنگ آلود ہوجانے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے۔

(۵) ایماندار تاجر عابد سے بہتر ہے۔ کیونکہ تجارت میں امانت سخت مشکل کام ہے۔

(۶) وہ انسان نہیں دھرتی پر ایک بوجھ ہے۔ جو سکھ میں تو ساتھ دے، مگر دکھ کے وقت اپنا دامن کھینچ لے۔

(۷) عقلمند اپنے عیب خود تلاش کرتا ہے۔ اور بے وقوف کے عیب دوسرے لوگ دیکھا کرتے ہیں۔

(۸) اگر شاہراہ حیات پر مسکراتا ہوا چاند نہ بن سکو تو جھلملاتا ہوا صبح کا ستارہ ہی بن جاؤ جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو منزلوں کا نشان بتاتا ہے۔

(۹) نہ اتنا میٹھا بنو کہ دوسرے تمہیں نگل جائیں نہ اتنے کڑوے بنو کہ لوگ تھوک دیں۔

(۱۰) نہ اتنا نرم ہو کہ تمہیں نچوڑ لیا جائے نہ اتنے سخت کہ توڑ دیئے جاؤ۔

ملک کا نام	دارالحکومت
عوامی جمہوریہ یمن	مدینۃ الشاب
فلپائن	کویزن سی
پولینڈ	وارسا
پرتگال	لزبن
رومانیہ	بخارسٹ
اسپین	میڈرڈ
سویڈن	اسٹاک ہوم

مرسلہ..... محمد سلیم الرحمٰن، حیدر آباد

میرا کالج

علی احمد قریشی

سدا بہار جہاں ہے وہ ہے مرا کالج
ہمیشہ پیار جہاں ہے وہ ہے مرا کالج
یہاں علوم کی دولت لٹائی جاتی ہے
یہیں سے ہوتا ہے تکمیل زیست کا آغاز
اسی نے ہم کو عطا کی ہے قوت پرواز
اساتذہ یہ ہمارے ہیں پیار کی تصویر
بڑی لگن سے یہ کرتے ہیں قوم کی تعمیر
ہمیں نصاب محبت سے یہ پڑھاتے ہیں
ہمیں حیات کے اسرار بھی بتاتے ہیں
ہر ایک سمت ہے پھولوں کی انجمن دیکھو
ہر ایک اپنے فرائض میں ہے مگن دیکھو

اتفاق میں برکت ہے

تحریر: ای، آر، بوئی
ترجمہ: شیخ عاکف حمید، کاموںکے

ایک پرانے سے گھرانے میں ایک بلی رہتی تھی وہیں پر چوہوں نے ٹوکریوں اور پرانے صندوقوں میں اپنی رہائش کا انتظام کیا ہوا تھا۔ چوہے بلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دن بلی نے تمام چوہوں کو دعوت پر بلایا اور کہنے لگی۔

"آو ہم سب دوستوں کی طرح رہیں میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آئندہ تمہیں نہیں کھاؤں گی۔ تمام چوہے بہت خوش ہوئے اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ بلی کہنے لگی "لیکن ایک بات ہے جو آپ سب کو ماننی ہوگی۔"

"کونسی ایسی بات ہے؟" چوہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تم سب کو دن میں دو بار مجھے سلام کرنا ہوگا دن کے ایک بجے اور پھر دوسری مرتبہ شام سات بجے۔" "ہاں! ہاں! ہم ضرور ایسا کریں گے یہ کونسی مشکل بات ہے۔" چوہوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

بلی بہت خوش ہوئی چوہے بھی خوش تھے۔ وہ بلی کے ساتھ اکثر کھیلتے لیکن بلی کی نظر ہر وقت کلاک پر رہتی۔ جونہی ایک بجتا بلی حکم دیتی اب مجھے باری باری سلام کرو۔ چوہے بیچارے ایک ایک کر کے آتے اور سلام کر کے گزرتے جاتے۔ جب آخری چوہا آتا بلی اس پر جھپٹ کر اسے دبوچ لیتی اور کھا لیتی۔

چوہوں کو اس بات کا احساس ہی نہ ہوتا کہ ان کا کوئی ساتھی بلی کا نوالہ بن گیا ہے۔ چوہے اور بلی پھر اکٹھے کھیلتے رہتے جب سات بجتے چوہے ایک ایک کر کے آتے اور سلام کر کے چلے جاتے۔ بلی آخری چوہے پر پھر جھپٹتی اور پیٹ بھر لیتی۔ ایک دن ایک موٹا چوہا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کافی پیچھے رہ گیا۔ وہ بلی کو سلام کرنے کے لئے جلدی جلدی آرہا تھا کہ

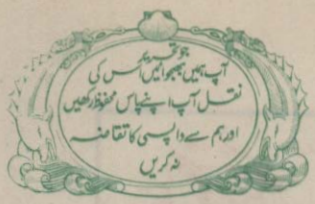

اس نے کونے میں بلی کو اپنے ایک ساتھی چوہے کو دانتوں میں دبائے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ بیچارا الٹے پاؤں بھاگا اور دوسرے چوہوں کو بلی کی اس کارستانی کے متعلق بتایا۔ وہ سب بہت غصے میں آگئے کہ کس طرح بلی انہیں دھوکہ دے رہی ہے۔ وہ مل جل کر بلی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ آخر موٹے چوہے نے ایک ترکیب ڈھونڈ نکالی وہ کہنے لگا۔

دوستو!

اب ایک ہی راستہ ہے جب بلی نظر آئے سب مل کر اس پر حملہ آور ہو جاؤ تو پھر وہ بوڑھی بلی تمہارے مقابلہ نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اتفاق میں برکت ہے۔ جب تم سب مل کر اس پر حملہ آور ہو گئے تو پھر وہ بوڑھی بلی تمہارا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ سب نے اس پر اتفاق کیا۔

آخر ایک بج گیا بلی چوہوں کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ مگر کوئی چوہا اسے سلام کرنے نہ گیا "وہ ضرور مجھے سلام کرنا بھول گئے ہیں۔" بلی نے سوچا اور پھر سو گئی۔

سات بجے دوبارہ بلی چوہوں کے انتظار میں رہی لیکن کوئی چوہا سلام کرنے حاضر نہ ہوا وہ بڑی پریشان ہوئی اور سوچنے لگی۔ آخر یہ چوہے کہاں چلے گئے ہیں میں خود ان کو بلاتی ہوں۔

"پیارے چوہو، تم سب کہاں ہو؟"

"ہم سب یہاں ہیں۔ بی مانو!"

اور سارے چوہے یکدم اکٹھے بلی پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے کان سے پکڑا کسی نے دم سے اور کوئی ٹانگ کو پکڑ کر کھینچنے لگا۔

بلی نے جب یہ دیکھا تو سمجھ گئی اب یہاں سے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آخر بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑا کر پرانے گھر سے بھاگ نکلی اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔

دیکھا بچو! چوہوں نے اتفاق سے اپنے دشمن کو مار بھگایا۔ سچ ہے "اتفاق میں بڑی برکت ہے۔"

ساتھی بچپن کے

اس ماہ شائع ہونے والے ساتھیوں کے تعارف

محمد عاقل احمد خان ۱۴ سال گیارہویں پسندیدہ مضمون اردو
مستقبل کا خواب، انجینئر تعلیمی ادارہ، گورنمنٹ اسلامیہ سائنس کالج
پتہ: مکان نمبر ۴۸۱ اے، شاہی بازار پرانا سکھر

قیصر عزیز ۱۶ سال گیارہویں پسندیدہ مضمون اسلامیات
مستقبل کا خواب حافظ اور اچھا شہری تعلیمی ادارہ گورنمنٹ ڈگری کالج
پتہ، مکان نمبر ۲۸۳/ڈی، محلہ قصاباں، ڈی آئی خان

ساجد حبیب عزیز ۱۴ سال دسویں پسندیدہ مضمون طبیعات
مستقبل کا خواب، ڈاکٹر تعلیمی ادارہ، میری کلاکو
پتہ: ۱۵/۴ بشیر منزل، عثمانی کمپاؤنڈ۔ کراچی

سید منصور علی ۱۶ سال گیارہویں پسندیدہ مضمون سائنس
مستقبل کا خواب انجینئر تعلیمی ادارہ ڈگری سائنس کالج
پتہ، مکان نمبر ۸۰۳ نئی آبادی ۳۴ ڈی کورنگی ۲½۔ کراچی

سید نعیم الحق ۱۴ سال نہم پسندیدہ مضمون انگریزی
مستقبل کا خواب ڈاکٹر تعلیمی ادارہ پروگرامر سیکنڈری اسکول
پتہ : آر ، ۱۴۱۴ سیکٹر ۸ ، نارتھ کراچی

سلیم خالق ۱۵ سال دسویں پسندیدہ مضمون حساب
مستقبل کا خواب کرکٹ کھیلنا تعلیمی ادارہ نیازی گرامر اسکول
پتہ : ڈی ۹۸ سیکٹر ۵/۱۷-۱۵ بفرزون ، نارتھ کراچی ۔

شیخ عمران طاہر ۱۶ سال دسویں پسندیدہ مضمون ، سیاسیات
مستقبل کا خواب ، انجینئر تعلیمی ادارہ ، گورنمنٹ ایم سی ہائی اسکول
پتہ : یو بی ہوٹل جناح چوک عارف ، ضلع ساہیوال

عامر اقبال ۱۷ سال گیارہویں پسندیدہ مضمون ریاضی
مستقبل کا خواب : پائلٹ تعلیمی ادارہ ، گورنمنٹ کالج ہری پور
پتہ : مکان نمبر ۴۳۲ ، محلہ ... ہری پور

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں
کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی — ہر شام سہانی

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام _____ کلاس _____

عمر _____ اسکول _____

پتہ _____

_____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____

کلاس _____ پسندیدہ مضمون _____

مستقبل کا خواب _____

اسکول _____

گھر کا پتہ _____

تصویر اس سائز میں ہو؛

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) _____

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

سُنا ہو تو سُنائیے

دیکھا ہو تو بتائیے

کوئی ایسا ماہنامہ

جس نے

- منفرد موضوعات پر ہر سال دو خاص نمبر شائع کئے ہوں۔
- جس کی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تخلیق سے عبارت ہو۔
- جس کے خصوصی شمارے اپنے موضوعات پر مستند کتاب کی طرح مستقل علمی حوالہ بن گئے ہوں۔
- جس نے اپنے خاص نمبر کے ساتھ انوکھے اور حسین تحائف دینے کی رسم ڈالی ہو۔
- اور جس نے مختصر ترین وقت میں لامحدود اشاعت کا ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اگر آپ ایسا ماہنامہ کہیں تلاش کر پائیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں

ماہنامہ

آنکھ مچولی

ڈی-۱۱۲، سائٹ، کراچی

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ایسا نہ کیجئے

آپ کا بچہ غیر معمولی ذہین بھی ہو سکتا ہے اور غیر معمولی کُند ذہن بھی۔ ایسی صورت میں کہ وہ بہت ذہین ہے اس کی ذہانت کی حفاظت کیجئے اور اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کیجئے اور اگر یہ بچہ صلاحیتوں کے اعتبار سے کم ہے تو اس کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کیجئے مگر ایک بات یاد رکھئے کہ اپنے بچے کا موازنہ کبھی دوسرے بچے سے اس طرح نہ کیجئے کہ اس میں کسی ایک بچے کے لئے حوصلہ شکنی کی صورت نکلے۔ عموماً ایک ہی گھر کے دو بچوں میں کوئی ایک زیادہ ذہین، فرض شناس اور آپ کا کہا ماننے والا ہوتا ہے جبکہ دوسرا قدرے لاپرواہ اور غافل۔ ایسی صورت میں اگر آپ کا رویہ یہ ہے کہ نسبتاً بہتر بچے کی ہر وقت تعریف اور قدرے کم تر کو ہر وقت برا بھلا کہنا۔ تو ایسے میں آپ یہ نہ بھولیں کہ آپ کا رویہ کم تر بچے کو بدتر بنانے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں۔

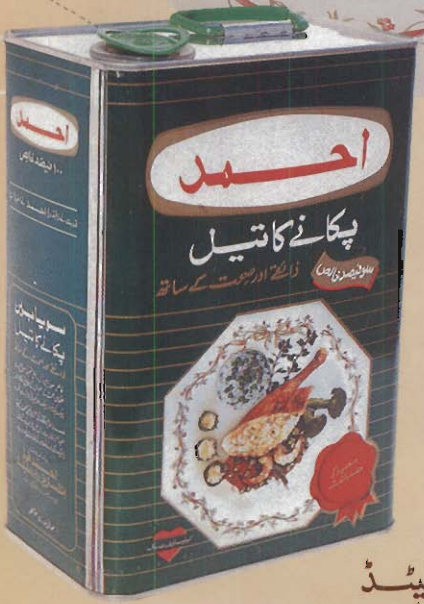

باسہولت
پلاسٹک نوزل
کے ساتھ
معیار کی
ضمانت
احمد
پکانے کا تیل
سو فیصد خالص
ذائقہ اور صحت کے ساتھ
©
احمد
امپورٹیڈ پکانے کا تیل
دنیا کے جدید ترین پلانٹ پر
الٹرا ریفائنڈ (Ultra-refined) کیا ہوا
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112 سائٹ، کراچی 75700 فون: 49-296045 فیکس: 295470 ٹیلیکس: 2465 AHMED PK

REGD. No. M-266 FEBRUARY 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

SUPER CRISP

Snacks for all seasons

مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور آب بادام بھی

Tripple - Em (Pvt) Ltd.
72/C-I Gulberg III, Lahore. Pakistan
Ph: 871672 - 876396 - 876797
Telex: 44925 MALIK PK Fax: 042-870-965

SUPER CRISP
NIMKOMIX
PEANUTS
DAL MOONG
ALMONDS
FRIED & SALTED

EVERNEW CONCEPTS